لا تبتسم ولا تحزن

www.taemeernews.com

افسانے

www.taemeernews.com

افسانے

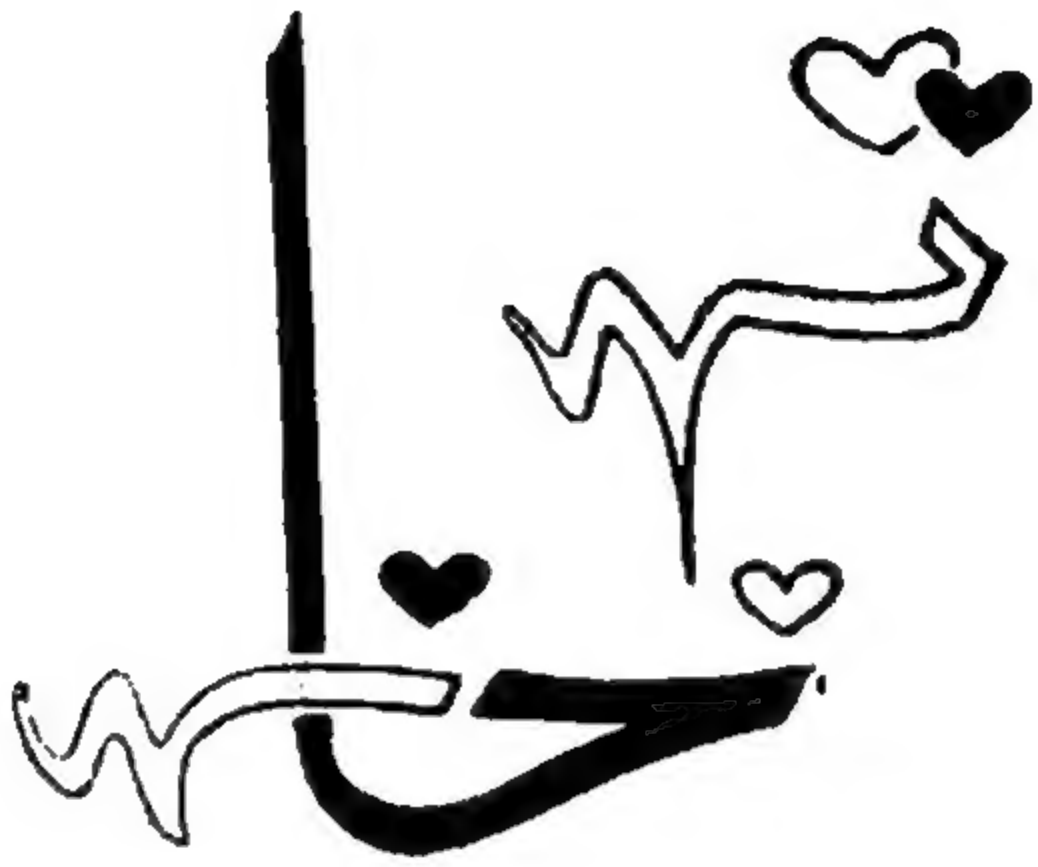

تہ خانہ

واجدہ تبسم

تقسیم کار

"مکتبہ فسانہ"

۲۱۶ دائرہ شاہ اجمل الہ آباد

www.taemeernews.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

بار اول ۱۹۶۸

تعداد اشاعت ۵۰۰

طابع اسرار کریمی پریس

واجدہ تبسم

قیمت ۱۲/

www.taemeernews.com

اپنی بے حد پیاری

عقیلہ آپا

کے نام

جن کی اچانک موت نے زندگی کو بے پناہ

اداس کر دیا ہے

www.taemeernews.com

فہرست

میری کہانی	۹
تہ خانہ	۳۳
ساتواں شہزادہ	۵۵
فاختہ	۷۹
سہاگن	۹۱
عیدی	۱۱۵
شہر ممنوع	۱۲۷
کانچ کا دِل	۱۵۳
اے رودِ موسیٰ	۱۷۱

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

نقش حیات

www.taemeernews.com

میری کہانی

مجھے افسانے لکھتے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ میری برسوں کی محنت آپ کے سامنے ہے، کیوں کہ جہاں تک محنت کا سوال ہے، میں نے افسانے لکھنے میں کوئی محنت نہیں کی۔ میں نے تو افسانہ نگاری یوں شروع کی کہ محنت یا کاوش کا کوئی سوال ہی نہ اٹھا۔ مجھے ایک طرح سے اپنی افسانہ نگاری کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس کی وجہ سے میرے دل کا بوجھ ٹلا۔ میں آپ سے بتاؤں کہ اگر میں افسانے نہ لکھتی تو یقیناً ایک نہ ایک دن میرا دل پھٹ جاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ میں افسانے لکھنے لگی اور دل میں چھپے ہوئے غم اور احساسات جب ایک ایک کر کے لفظوں کی صورت میں ڈھلنے لگے تو میں نے جانا کہ اب میں کبھی نہ مر سکوں گی (یہاں میرے ایسا کہنے سے آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ اس طرح "میں کبھی نہ مر سکوں گی" جیسے سیدھے سادے جملے میں جتانا چاہ رہی ہوں۔ "اب میں ایسی مانی ہوئی فنکار ہو گئی ہوں کہ مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں مر گئی تو کیا ہوا۔ میرا فن تو مجھے زندہ رکھے گا۔!" جی نہیں، ایسی کوئی خوش فہمی مجھے اپنے متعلق نہیں ہے۔ اور خوش فہمی ہے بھی کیوں؟ ابھی میں نے لکھا ہی کیا ہے؟ ویسے جی چاہتا ضرور ہے کہ اتنی بڑی فنکار بن جاؤں کہ میرا نام ہمیشہ زندہ رہے۔ دل میں لگن تو موجود ہے ہی۔ مگر اپنی افسانہ نگاری کا خیال آتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ بال سے بندھی دو دھاری تلوار سینے پر لٹک رہی ہے، اب گری کہ اب گری۔

www.taemeernews.com

یہ اتنے سال اسی دھک دھکاہٹ میں گزرے ہیں۔ کیا پتہ یہ تلوار کب گر جائے اور یوں قصہ پاک ہو جائے۔ کانٹوں بھری اس راہ پر چلتے ہوئے کئی بار میں نے یوں محسوس کیا ہے کہ ابھی ابھی گر پڑوں گی، مگر سخت جان ایسی تھی کہ کبھی نہ مر سکی۔ جی ہاں کہہ لیجیے کہ "بھئی واجدہ تم بڑی بزدل لڑکی ہو" لیکن آپ کے کہہ دینے سے کیا ہوگا؟ ساحل سے کبھی اندازۂ طوفاں لگایا جا سکا ہے؟ آپ نے مجھے بزدل کہہ دیا اور میں نے مان بھی لیا، لیکن اس ایک لفظ 'بزدل' کے پیچھے جو ایک لمبی چوڑی داستان چھپی ہے، اسے سن کر آپ کیا فیصلہ کریں گے۔؟

کئی کئی بار مجھ سے میرے حالات زندگی جاننے کی فرمائش کی گئی۔ اس جذبے کی تلاش اور جستجو کی گئی جو میری افسانہ نگاری کا محرک بنا۔ ہمیشہ تو ٹالتی گئی، سوچتی ہوں آج موقع آیا ہے تو کہتی ہی چلوں۔ پھر آپ میں سے جو مجھے بزدل کہہ رہے ہیں خود ہی فیصلہ کریں گے کہ حق پہ کون تھا؛ لیکن اب جب کہ اپنے حالات زندگی اور افسانہ نگاری کے بارے میں "کچھ" لکھنے بیٹھی ہوں تو بڑی طرح ہنسی آرہی ہے۔ مجھ ایسی لڑکی کے حالات زندگی۔! اور پھر افسانہ نگاری۔؟ حالات زندگی ہی تو کمبخت ایسے تھے جنہوں نے افسانہ نگاری پر مجبور کر دیا۔ مگر اب خیال آتا ہے کہ اس طرح تو وہ راز بھی کھول دینے پڑیں گے جو دل بن کر سینے میں دھڑک رہے ہیں، آنسو بن کر آنکھوں میں مچلتے رہتے ہیں اور مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر بکھر بکھر گئے ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ آج ان آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا حساب لے کر ہی رہیں گے۔

اپنی چھاچھ کو کوئی گوالن کھٹا نہیں کہتی۔ مگر میں وہ بے رحم نقاد ہوں جو کبھی جانب داری سے کام نہیں لیتا۔ پھر میں آپ کے سامنے یہ کیوں کہوں کہ میرا ماحول میرے لئے بڑا سازگار تھا؟ اگر میں یہ جھوٹ کہہ بھی دوں تو میری کہانیاں چغلی کھا دیں گی۔ پھر میں سچائی سے کام کیوں نہ لوں؟ میرا گھرانا، سیدوں کا وہ گھرانا تھا۔ (جی ہاں صیغۂ ماضی کیوں کہ اب تو ہم نے بقول کسے "فارورڈ" ہو کر بزرگوں کی ناک کٹا ڈالی ہے۔) جہاں پردے کی سخت قید و بند تھی اور لڑکیوں کی کسی قسم کی آزادی کا تصور بھی ناممکن تھا۔ حد یہ ہے کہ میرے ابّا نے ہم بہنوں کو اسی لئے اسکول میں داخل نہ کروایا کہ "لڑکیاں اسکولوں میں پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتی ہیں" تین سال کی عمر میں جب ہمارے سروں سے ماں اور باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا تو پھر چچا نے نانی اماں سے بڑی منتیں کیں اور یوں ہمیں اسکول میں داخلہ مل گیا۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، کیوں کہ اس طرح تو ہماری نگرانی کی اور زیادہ ضرورت تھی (کیا پتہ ہم کب پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتے؟) اور وہ حسبِ ضرورت کی بھی جاتی تھی۔ ہماری بہنوں میں جو بہن تیسرے نمبر پہ تھی، وہ بڑی ذہین اور ذرا خود سر قسم کی تھی۔ اُسے جب اسکول میں داخل کروایا تھا اس وقت اس کی عمر صرف تین سال تھی۔ ٹھیک سے بات کرنی بھی اُسے نہ آتی تھی مگر قصے کہانیاں پڑھنے کا اُسے وہ شوق تھا کہ پوچھیے نہیں۔ ظاہر ہے ابھی الف بے بھی ٹھیک سے یاد نہ تھی تو پڑھنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ مگر جوں جوں وہ پڑھنا سیکھتی گئی اس کا یہ شوق پختہ ہوتا گیا۔

اُن دنوں ہمارے یہاں بہت سارے رسالے آیا کرتے تھے۔ 'شمع' سے لے کر 'گلستان'، 'آریہ ورت' اور 'کامیاب' تک۔ اور اسی قسم کے اور کئی دوسرے پرچے۔ میں ہر پرچہ الف سے لے کر یے تک چاٹ جایا کرتی۔ جنون یہیں پر ختم نہ تھا۔ گھر کا ماہانہ سودا سلف جن کاغذوں میں، رسالوں کے پھٹے ہوئے صفحوں میں بند ہو کر آتا تھا وہ میرے لیے سب سے بڑی دلچسپی تھے۔ میں وہ سارے کاغذ سمیٹ کر کونے میں جا بیٹھتی اور ہر ادھورا اور مکمل مضمون پڑھ ڈالتی۔ میرا دل چاہا کرتا ساری دنیا کا علم گھول کر پی جاؤں۔ جی نہیں میں نے غلط کہا، یہ "علم" والی ترکیب تو میں اب، یعنی ایم۔ اے ہو کر بگھار سکتی ہوں۔ اُن دنوں میں چوتھی یا پانچویں میں پڑھتی تھی اور علم کا کوئی واضح تصور اپنے ذہن میں نہ رکھتی تھی۔ یوں کہیے ہر تحریر پڑھ جانے کی دل میں تمنا رکھتی تھی، چاہے وہ کیسی ہی گری پڑی کیوں نہ ہوتی۔

ابھی تک تو میں آپ کو صرف اپنے شوق کے بارے میں بتاتی آ رہی ہوں، ابھی میں نے آپ کو اپنے "حالات" کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں ان دونوں چیزوں کو، یعنی حالاتِ زندگی اور افسانہ نگاری کو، الگ الگ کر بھی نہیں سکتی۔ میرا دل چاہا کرتا کہ کبھی بازار جاؤں اور اچھی اچھی کہانیوں والی کتابیں خرید لاؤں۔ مگر شاید آپ کو میں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ پیسہ ان دنوں سورج ہوا کرتا تھا، دور سے جھلک دکھانے والا۔ جس کی کتنی ہی تمنا کریں ہاتھ نہیں آ سکتا۔ بڑی عجیب بات تو یہ ہے جناب کہ (کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے۔) میری امی ایک نواب خاندان سے تھیں۔ ابا شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ مجھے نہیں پتہ، مگر میں بچپن سے سنتی آ رہی ہوں کہ انھوں نے لاکھوں روپیہ کمایا ــ کمایا بھی اور گنوایا بھی۔ اور جب مرے ہیں

اس وقت دفنانے کو بھی کچھ نہ تھا۔ امی کی بات نہ پوچھئے، وہ تو بڑی رئیس تھیں۔ جہیز میں ڈھیروں سونے کے علاوہ پانچ گاؤں ساتھ لائی تھیں۔ نانی اماں آج بھی کہتی ہیں کہ "اگر میں نے اس سونے کا آدھوں آدھ بھی اٹھا کر رکھ دیا ہوتا تو میری چاروں نواسیاں اور بہوئیں سونے میں پیلی رہتیں۔ (ہم آٹھ بہن بھائی ہیں) مگر نانی اماں نے تو ایک ماشے کا تار بھی اٹھا کر نہ رکھا۔ یہ گھپلا بچپن تک تو کبھی میری سمجھ میں نہ آیا، مگر آج تو ہر بات آئینہ کی طرح روشن ہے۔ پہلے میری امی مریں۔ (اس وقت میں ایک سال کی تھی) اس کے دو سال بعد میرے ابا بھی چل دیئے۔ (اچھے لوگ تھے بے چارے، بو ہر فکر سے آزاد ہو گئے) مگر ہم آٹھ بہن بھائی نانی اماں کے لئے پرابلم بن گئے۔ میں نے ابھی آپ سے بتایا ہے نا کہ میرے ابا بہت فضول خرچ تھے۔ اپنی کمائی تو گنوائی ہی گنوائی، امی کا جہیز بھی گنوایا۔ قرضوں کے ڈھیر لے رکھے تھے۔ جانے کتنا قرضہ تھا کہ ساری دولت چپ چپاتے غائب ہو گئی۔ نانی اماں یوں نہ کرتیں تو جانے اس عزت کا کیا حشر ہو جاتا جو برسوں سے "خاندانِ سادات" کے سر پر تاج بن کر جگمگاتی رہی تھی۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ ابا مرے تو کفن بھی دوسروں نے پہنایا۔ جب یہ صورت حال نظر آئی تو ظاہر ہے سب رشتہ دار سنّاٹے میں آ گئے اور ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ (رشتہ دار نا کبھی نہ ڈھیلے میں تو صرف اپنی کہانی سُنا رہی ہوں) جب گھر خالی رہ گیا تو صرف ہم چار بہنیں اور چار بھائی تھے جنہیں سوائے نانی اماں کے اور کسی کا آسرا اور سہارا نہ تھا۔

نانی اماں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے گھر میں روپیوں پر چلتی تھیں۔ (یہ مبالغہ نہیں افسانوی تراش نہیں، حقیقت ہے!) بے حساب تھیلوں میں بے حساب روپے ہوتے اور انھیں جگہ نہ ہونے کے کارن کوٹھری میں اناج کے بوروں کی طرح اوپر تلے ٹھونس دیا جاتا۔ اب وہی نانی اماں رہے سہے زیور کو توڑ توڑ کر ہماری تعلیم تربیت کر رہی تھیں۔ گاؤں سے زمینوں کا پیسہ بھی آ جاتا تھا اور یوں زندگی گزر رہی تھی۔ بڑی بے رنگی اور بے دلی سے۔ عموماً ہم لوگ جوار کی روٹی اور دال کھاتے تھے اور اپنے اپنے بستے لٹکائے انگریزی پڑھنے اسکول میں جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کیمپ والی سیمنٹ روڈ پر سے جب ہم مڑتے تھے تو لال گرجا کے پاس ایک بہت اونچا بنگلہ تھا۔ بنگلے کے پھاٹک پر ہری بھری بیل جھولتی تھی جس میں سرخ کے پھولوں کے بے حساب گچھے لٹک رہے تھے۔ رنگ برنگے پھولوں کے گملوں کی دو رویہ قطار دور

تک چل کر پھاٹک سے مل جاتی۔ پورٹیکو میں گہرے نیلے رنگ کی لمبی سی کار کھڑی ہوا کرتی اور عین چائے وہاں سے گزرنے کے ٹائم تیس چار بجے بجتے۔ اچھلتے، پردے ہٹاتے ڈرائنگ روم سے باہر آتے اور قہقہے لگاتے ہوئے کار میں چڑھ جاتے۔ ان کے پیچھے ان کی آیا، ساروں کے بستے سمیٹے فرنٹ سیٹ میں بیٹھ جاتی اور کار زوں زوں کرتی یہ جا وہ جا۔ سڑک پر ہلکی سی گرد اڑتی اور وہ خاک ہمارے حلق میں پہنچتی۔ میرے بستے کا بوجھ میری جان لے ڈالتا اور سیمنٹ روڈ پر چلتے چلتے میں سوچنے لگتی کہ مروں گی تو اپنی قبر پر کیسا کتبہ لگواؤں گی۔

"یہاں وہ دل دفن ہے جو زندگی
بھر خوشی کے لئے روتا رہا"

تو جناب میں آپ سے بتا رہی تھی کہ صورت حال یہ تھی تو کتابوں کے لئے روپے کہاں سے آتے؟ نانی اماں بے چاری کا تو ناطقہ بند تھا۔ کبھی نہ کبھی ایک آدھ بہن بھائی اڑ جاتا:۔

"میں تو انڈا کھاؤں گا"

"اوں اوں۔۔۔ میں تو گھی شکر کھاؤں گی۔"

نانی اماں کہتیں: "گھی شکر؟ یہ کون بڑی بات ہے! گز بچو میں تو گھی شکر چوہے سے مانگ کر لایا کرتی ہوں، اور اس چوہے کو بچے بہت ناپسند ہیں۔ بس تم اوپر چلے جاؤ۔ یا پھر اپنی آنکھیں بند کر لو۔" ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے اور تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے سچ مچ رکابی میں گھی شکر موجود۔ اگر ہم میں سے کبھی کسی نے گھی کھایا ہوتا تو اصلیت بھانپ جاتا، مگر ہم تو سچ مچ ہی بچے تھے پتہ نہیں کیسے، بہت دنوں بعد، ایک دن یہ بھید کھل گیا کہ وہ چوہے ماموں بے حد فراڈ تھے کمبخت ہمیشہ گھی کی بجائے پانی کھلاتے رہے۔ پتہ نہیں کتنا پانی اور شکر ہم گھی شکر کے دھوکے میں کھاتے رہے۔

میں تو کبھی ایک پیسے کی کتاب بھی اپنے لئے نہ خرید سکی!! کبھی نانی اماں سے کہا بھی تو انہوں نے بڑی صفائی سے ٹال دیا۔ "اچھی بیٹیاں کتابیں نہیں پڑھا کرتیں۔" اور یوں بھی ان کی تنبیہ جاری ہی رہتی تھی کہ ناول بالکل نہ پڑھا کرو۔ لیکن یہ مناہی ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا۔

ہماری ماما غائب ہو گئی۔ کھانا پکانے کی سخت مشکل جا پڑی تھی۔ نانی اماں ہر کسی سے کہا

تہ حت :

کرتیں کہ " ایک ماما لادو۔ مجھ سے تو اتنے سارے بچوں کی دیکھ بھال ہی نہیں ہوتی، کھانا کیسے پکاؤں؟"

مامائیں لائی جاتیں اور کسی نہ کسی وجہ سے رجکٹ کر دی جاتیں۔ ایک دن مغرب کے بعد نانی اماں صحن میں میتھی کی بھاجی توڑتی بیٹھی تھیں۔ بھیا لوگ تخت پر ہوم ورک کرنے بیٹھے تھے۔ بہنیں پڑھ رہی تھیں اور میں شطرنجی پر سر نیہوڑائے، پنسل منہ میں دبائے، بہت انہماک سے بیٹھی حساب حل کر رہی تھی۔ اسی دم کسی نے ماما کو بھجوایا۔ نانی اماں حسب معمول جرح میں مشغول ہو گئیں۔ میں نے یوں ہی ایک بار سر اٹھا کر دیکھا، ماما کی گود میں ڈیڑھ دو برس کا بچہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ میں پھر کاپی پر جھک گئی۔

نانی اماں نے ادھر اُدھر کے مختلف سوالوں کے بعد پوچھا۔

" تمہارا مرد کیا کام کرتا ہے۔"

" مرد تو چار سال ہوئے مر گیا۔"

میں نے لیمپ کی روشنی سے نگاہیں ہٹا کر ماما کو دیکھا، کاپی بند کی، پنسل نیچے رکھی اور برآمدے میں آکر بڑے معتبر انداز میں بولی :۔

" کیوں جی تمہارا مرد تو مر گیا۔ پھر یہ بچہ کہاں سے آیا؟" (میری عمر اس وقت آٹھ یا نو سال رہی ہوگی۔)

پتہ نہیں اس سوال میں کون سے دھماکے کا اثر تھا کہ نانی اماں اکدم بھیچک رہ گئیں۔ پہلے تو انھوں نے دیدے پٹ پٹا کر اپنے نواسوں کو دیکھا، پھر ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں، پھر چلا کر کہا :۔ " اور پڑھنے دو اسے رسالے۔"

میں اکدم چکرا گئی۔ اپنے سوال کی نوعیت پر غور کیا تو کوئی برائی اس میں نظر نہ آئی۔

میں ابھی سراسیمہ سی کھڑی ہی تھی کہ نانی اماں گرجیں :۔

" آج سے تیرے ہاتھ میں کوئی رسالہ دیکھوں...... "

میری سمجھ میں خاک نہ آیا کہ مجھے اتنی بڑی سزا کیوں ملی۔ نانی اماں بھائیوں سے الجھنے لگیں۔ میرے ایک بڑے بھیا ہمیشہ میری سائڈ میں رہتے تھے۔ اگر کبھی نانی اماں پڑھنے کو منع کرتیں تو ہمیشہ کہا کرتے :۔

" نانی اماں اسے پڑھنے سے نہ روکئے۔ بہت ذہین ہے۔ آگے چل کر یہ خود بھی کہانیاں لکھے گی۔" اب نانی اماں انہی کے پیچھے پڑ گئیں کہ ابھی سے یہ حال ہے تو آگے چل کر کیا ہوگا؟ شاید وہ بھی لاجواب ہو گئے۔ مگر میں رات گئے تک بستر میں ساکت و صامت لیٹی رہی۔ میری سمجھ میں پھر بھی نہ آیا کہ میں نے ایک جملے میں کون سا گناہ

کر ڈالا تھا! (اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے، بچپن میں ہم کس قدر بے باک ہوتے ہیں۔!)

اس دن سے خوشیوں کے دروازے مجھ پر بند ہو گئے۔ اور میری خوشیاں ہی کیا تھیں؟ پڑھنا۔ پڑھنا۔ بس پڑھنا۔ اب یوں ہونے لگا کہ جہاں میں نظروں سے اوجھل ہوئی نانی اماں نے پکارنا شروع کیا:۔

"وہ بدذات کدھر ہے؟ وہ مردار کہاں غائب ہو گئی؟"

میں نے ابھی آپ سے بتایا تھا کہ میں ان دنوں بہت سوچتی تھی کہ اپنی قبر پر کیسا کتبہ لگواؤں گی۔

"یہاں وہ پھول دفن ہے جو بھری بہار میں مرجھا گیا۔"

میں بچپن ہی سے غیر معمولی حساس ہوں۔ جس بات کو آپ بھول کر بھی مائنڈ نہ کریں، میں اسی بات پہ گھنٹوں روتی ہوں۔ آج بھی میری یہی فطرت اور عادت ہے۔ اس دلِ حساس نے مجھے اتنا رلایا ہے کہ پھر بھی مجھے اپنی فطرت کا یہ پہلو پسند ہے، میں جیتی ہی اس کے سہارے ہوں۔ (ایک دن میں یوں ہی غلطی سے ایک چیونٹی کو مار بیٹھی۔ قصور میرا ذرا بھی نہیں۔ وہ میرے پیر تلے آ گئی۔ بیٹھے بیٹھے میں نے یونہی پیر ہٹایا تو وہاں میری ہلائی چیونٹی پڑی تھی۔ اس حادثے نے مجھے تین دن تک نڈھال رکھا۔ پتہ نہیں اس کے کتنے بچے ہوں؟ اس کے منہ میں شکر کا دانہ بھی تو تھا۔ اب کون اس کی جگہ لے سکے گا؟)

اب مجھے اپنے سائے سے بھی ڈر ڈر کر چلنا پڑتا تھا۔ میں جہاں بھی تنہائی پاتی فوراً اُدھر کا رخ کر لیتی۔ ہمارا گھر بہت بڑا تھا۔ تین منزلہ، ادھر اُدھر بڑے بڑے آنگن، برآمدے، دالان، کئی جگہیں ایسی تھیں جہاں میں چوری چھپے پڑھ سکتی۔ مگر اس دن کے بعد مجھے بہت کم موقعے ملے کہ میں نانی اماں کی نگاہوں سے غائب ہو سکتی۔ میرے ایک بھائی تھے، سگریٹ کے شوقین، ان کا ڈھنگ بھی نرالا تھا۔ نانی اماں کے ڈر سے وہ اس طرح سگریٹ نوشی کرتے کہ خود کو رضائی میں وہ بالکل چھپا لیتے اور اندر مزے سے سگریٹ دھونکتے رہتے۔ (ان کی اس چوری کا راز یوں کھلا تھا کہ مہربان نے ایک بار نئی رضائی جلا ڈالی تھی) ایک دن میں نے غور سے انہیں دیکھا اور خود بھی اس ترکیب پر عمل کرنے لگی۔ مگر ہوتا یوں تھا کہ اس طرح سر سے پیر تک خود کو ڈھانک لینے سے ایک تو دم گھٹنے لگتا تھا۔ دوسرے "کمرے" میں اندھیرا بہت ہو جاتا تھا اور الفاظ نظر نہ آتے تھے۔ میں نے اس کے لئے ٹارچ کا انتظام کیا تھا۔ مگر ایک بار یوں ہوا کہ رضائی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ رضائی میں جگہ جگہ سے روئی ہٹ گئی تھی اور یوں روشنی چھن چھن کر باہر جانے لگی تو انجام

ظاہر ہے۔ مگر ایسی ویسی باتوں سے ہار جانا تو گویا میرے ذوق کی توہین تھی۔ میرا ذہن نت نئے طریقے ایجاد کر لیا کرتا تھا۔ پڑھائی کے سلسلے میں مجھے کبھی کسی اہتمام کی ضرورت نہ پڑی۔ ہمیشہ سے میرا اصول رہا کہ امتحان سے چند دنوں پہلے ایک دو بار گہری توجہ سے پوری کتابیں دیکھ ڈالیں اور بس معاملہ ختم۔ مگر میں گھر والوں پر یوں پوز کرتی تھی کہ جیسے میں بڑی بکش ——— (BooKisH) بڑی ہی پڑھاکو ہوں۔ جب دیکھو تب کتاب منہ سے لگی ہے۔ (یہ مدتوں کا راز ایک دن کھل ہی گیا۔) میں کرتی یہ تھی کہ کورس کی کتابوں یا کاپیوں میں اندر ناول اور رسالے رکھ رکھ کر پڑھا کرتی تھی۔ اگر کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں بڑے انہماک سے امتحان کی تیاری میں مشغول ہوں۔ مگر میں تو دوسرے ہی امتحان کی تیاریاں کیا کرتی تھی۔ حد یہ ہے (ممکن ہے آپ میں سے بہت سے یقین کریں بھی نا) کہ عین امتحان کے دنوں میں بھی ناول پڑھا کرتی۔ بدبختی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک دن ایک رسالہ کاپی میں چھپا کر پڑھ رہی تھی۔ کسی نے مجھے کوئی کام بتایا۔ میں نے یوں ہی رسالہ اور کاپی زمین پر رکھ دی اور باہر چلی گئی۔ کاپی پتلی تھی، اچانک ہوا کے ایک جھونکے سے اڑ کر دور جا پڑی اور رسالہ نمایاں ہو گیا۔ کسی مہربان بھیا نے یہ واردات نانی اماں سے جا بتائی۔ نانی اماں نے اتنا مارا، اتنا مارا کہ میرا بیہوش ہونا باقی رہ گیا۔ یہی میری زندگی تھی۔ یہی میرے ذوق و شوق کا انعام !!

میں اُن دنوں زندگی سے سخت بد دل ہو رہی تھی۔ انہی دنوں مجھ پر ٹائیفائیڈ کا شدید حملہ ہوا۔

میرے ابا بہت ہی حسین و جمیل آدمی تھے۔ خاندان میں تو ان سا کوئی تھا ہی نہیں، اور کہیں نکل جاتے تو لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہتے۔ امی حسین نہیں تھیں۔ رنگ سانولا تھا، بال لمبے لمبے تھے مگر ان کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ اتنی روشن آنکھیں کہ آنکھوں کا اجالا گالوں پر پڑتا تھا۔ میں نے تو اپنی امی کو نہیں دیکھا، ان کی تصویر بھی نہیں ہے۔ ہاں کہنے والے کہتے ہیں کہ اتنی اچھی آنکھیں بس کہانی کی خیالی ہیروئن کی ہو سکتی ہیں! ان دونوں کے میل سے جو بچے ہوئے وہ جیسے کچھ بھی نہ تھے، مگر شاید میری بدنصیبی تھی کہ اپنے سب بہن بھائیوں میں معمولی میں تھی۔ اور مزید ستم یہ کہ بچپن ہی سے بیمار رہتی چلی آ رہی تھی۔ تندرست اور نک سک سے درست بہن بھائیوں میں ایک میں بھی تھی جس کا رنگ سانولا تھا، جسم دبلا پتلا، کمر سے نیچے جاتے ہوئے بال

اور مجھی مجھی آنکھیں قد کی مناسبت سے بال بہت ہی لمبے نظر آتے۔ یوں سب لوگ مجھے چڑیل یا کالی بلی کہہ کر ستایا کرتے۔ میں شدید احساس کمتری میں مبتلا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم عمروں سے محبت نہ پا کر میں نے اپنی تنہائیوں کا ساتھی کتابوں کو بنایا تھا۔ (یہ بات تو مجھے بہت پہلے ہی کہہ دینی چاہیے تھی۔)

بیماری جمیل کر اُٹھی تو اور زیادہ چڑچڑی اور زود رنج ہوگئی۔ احساس دگنا ہوگیا۔ زندگی تلخ ہوگئی، میں آپ سے بتاؤں، ان دنوں کتابوں کا سہارا نہ ملا ہوتا تو آج میں یہ سب کچھ نہ لکھ رہی ہوتی سر!

سب طرف سے ہار کر میں نے مطالعہ میں جی لگایا۔ اس طرح کلاس میں فرسٹ رہنے لگی۔ استانیاں بہت خوش رہتیں۔ میں نے اپنی ذہانت سے ایک نا جائز فائدہ یہ اٹھایا کہ مس سے یہ پرمیشن حاصل کرلی کہ میں لائبریری سے جتنی چاہوں اتنی کتابیں لے لیا کروں۔ میری ریڈنگ ہمیشہ سے بے حد فاسٹ ہے۔ دو تین سو صفحوں کی کتاب ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ختم کر ڈالتی ہوں۔ مس کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ! اور یہ میری زندگی کی سب سے پہلی خوشی تھی۔ معصوم مسرت۔ !

ہم لوگ چونکہ بہت غریب تھے اس لئے پیدل ہی اسکول جایا کرتے۔ غریبی میں لوگ اپنے بچاؤ کیسے کیسے جواز ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اگر کبھی ہم نے پیروں میں درد کی شکایت کی تو نانی اماں نے جھٹ کہہ دیا۔

"پیدل چلنے سے صحت اچھی رہتی ہے"

کتابوں کا لالچ مجھے مارے ڈالتا۔ پاؤں پاؤں چلتے چلتے، میرے چھوٹے چھوٹے پیر دکھ کر رہ جاتے۔ اس پر مزید کوشش یہ کہ جلد سے جلد اسکول پہنچ جاؤں۔ تاکہ خوب پڑھ سکوں ! سینٹ روڈ والے بنگلے سے جب کار فراٹے بھرتی نکلتی تو دل کو پکا یقین ہو جاتا کہ اللہ میاں چونکہ بوڑھے ہو چکے ہیں اس لئے انھیں اب دنیا کا انتظام چلانا نہیں سوجھتا۔ یہ تک یاد نہیں کہ کسے موٹر کی ضرورت ہے اور کسے نہیں۔ خوب ہیں اللہ میاں آپ بھی !

میں تو بس یہی سوچتی ہوں کہ خداوند دو عالم نے میرے نصیب میں کتنی کم خوشیاں رکھی ہیں۔

کچھ ہی دنوں بعد ملک تقسیم ہوگیا۔ ۴۷ء کی آمد اور ہمارا وطن چھوڑ کر حیدرآباد آنا۔ یہ زندگی کا بڑا عجیب و غریب موڑ ہے۔ یہاں پہنچ کر تو زندگی کے ستم کچھ اور بھی ہو گئے۔

اب ہم بہنوں نے مڈل اسکول پاس کر لیا تھا۔ بہیا لوگ کالجوں کو جاتے تھے۔ اخراجات پہلے سے زیادہ تھے اور ذرائع آمدنی پہلے سے کہیں کم۔ میں بہت چھوٹی تھی اس وقت نانی اماں کے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیوں کا بھر واں جوڑا تھا۔ ۲۰ تولے کا۔ ۲۰ تولے کی کوئی حقیقت نہیں ۔ نانی اماں نے جب ضرورت پڑی ایک ایک چوڑی توڑ ڈالی۔ مجھے یاد ہے ہر بار جب سر تلے کر نانی اماں اندھیرے کمرے میں جایا کرتی تھیں تو ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ہوتا تھا، مگر مجھے یوں لگتا تھا چوڑی کے ساتھ میرا دل بھی کٹ جائے گا۔ کتنی بار چوڑیاں ٹوٹیں۔

کتنی بار دل کٹا۔ مگر اب تو زیور بھی نہ تھا جس کو توڑ تاڑ کر اخراجات پورے کئے جاتے۔ لے دے کر گاؤں اور زمینات کی چند ہزار کی آمدنی رہ گئی تھی جس سے سال بھر تک خرچ چلتا۔ زمینداری سسٹم لاگو ہوا تو وہ زمینات بھی حکومت کے بنک میں چلی گئی ۔!

(سنتے ہیں زیور سنگھار کے کام آتا ہے۔ ہمارا زیور تو سدا رہن رکھنے یا توڑنے کے کام ہی آیا!)

پارٹیشن کے وقت میری عمر گیارہ بارہ سال تھی۔ امراؤتی سے حیدرآباد دکن تک کا سفر ہم نے تیرہ دن میں طے کیا۔ ان تیرہ دنوں میں میں نے تیرہ صدیوں کا تجربہ سمیٹا ہے۔ میں کس قدر بوڑھی ہوں۔! اس کا احساس سوائے میرے اور کس کو ہو سکتا ہے۔؟ حیدرآباد آکر ہم نے جو مصیبتیں جھیلیں اس کا اندازہ آپ یوں لگائیے کہ اب تک جیسے ہم شاہی زندگی گزارتے آرہے تھے۔!! مصیبتیں کیا ہوتی ہیں؟ اس کا پتہ یہاں آکر چلا۔ ہمارے پاس کھانے کو اناج نہ تھا پہننے کو کپڑے نہ تھے، رہنے کو مکان نہ تھا، پھر بھی ہم جی رہے تھے اور خوش تھے۔ کتابیں خریدنے کو پیسے نہ ہوتے تھے۔ فیس کا وقت آتا تو ہم کلاسوں سے باہر کھڑے کر دیئے جاتے۔ ان دنوں میں نویں کلاس میں تھی۔ کلاس کی سب سے ننھی طالبہ تھی اور سب سے ذہین۔ سب سے غریب اور سب سے زیادہ بدنصیب ۔!!

حیدرآباد آکر سب سے بڑی بدنصیبی یہ رہی کہ میرا مطالعہ جیسے ختم ہو کر رہ گیا۔ لائبریری کے قوانین بہت سخت تھے۔

ایک لڑکی کو صرف ایک کتاب ملتی۔ وہ بھی ہفتہ میں ایک دن اور لائبریری میں اس قدر اچھی کتابیں تھیں ۔!!

بیرو کسانی

اے زر تو خدا نیست ولے

نویں کلاس میں ایک لڑکی تھی۔ اپنی آنکھوں، لمبے بالوں، سانولی رنگت اور میٹھی آواز کی وجہ سے کلاس بھر میں وہ 'بنگالی مینا' کے نام سے مشہور تھی۔ اُستانیاں پیار سے اسے "خوش آواز پرندہ" کہا کرتیں۔ قریبی سہیلیاں اُسے "بلبل" کوکی کرکر پکارتیں۔

وہ خوش آواز پرندہ میں تھی۔! میں نے اوروں سے اپنے بارے میں بہت سُنا تھا لیکن کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایک دن میں اپنی کرسی پر بیٹھی بے دلی سے کچھ گن گنا رہی تھی۔ میرے بازو والے ڈیسک پر ایک لڑکی بیٹھی لائبریری سے لی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے گن گناتا سُن اُس نے کتاب بند کر دی اور کہا :-

" واجدہ ذرا زور سے تو بھی گاؤ۔"

میری نگاہ کتاب سے جا کر ٹکرائی۔ وہ منشی پریم چند کا ناول "گئو دان" تھا۔ میں نے ذرا جھجک کر کہا :-

" ایک شرط پر۔"

" کون سی شرط ؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

" میں تمہیں گانا سناؤں گی اور تم بدلے کے طور پر مجھے یہ کتاب پڑھنے کو دو گی۔"

شرط ایسی کوئی کڑی نہ لگی اُسے۔ میں نے اسے ایک فلمی گیت سُنایا۔ "نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی۔ اور پھر غالب کی وہ مشہور غزل۔ "کیں کو ہم نہ روئیں جو......" کتاب میرے ہاتھوں میں تھی۔!!

یہ سودا مجھے بہت سستا پڑا۔ کیونکہ اس طرح گانا سُنا دینے سے میرا کچھ نہ بگڑتا تھا مگر مجھے بدلے میں کتابیں مل جایا کرتیں۔ پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں کلاس کی تمام لڑکیوں سے یہی سودا پٹنے لگا۔ جتنی کتابیں میں نے ان دنوں پڑھیں، ان کی تعداد بتانی مشکل ہے۔ دنیا آتی وسیع ہے، کتنے ہی رائٹرز گزرے ہیں جنہوں نے کیا کچھ نہیں لکھا ہے۔ میں نے کیا پڑھا؟ کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ مگر اپنے ناساعد حالات کے باوجود میں نے جتنا کچھ پڑھ لیا ہے اُس پر فخر کرتی ہوں۔ (حالانکہ میں نے سمندر سے قطرہ بھی نہیں اُٹھایا ہے)

پھر پولیس ایکشن ہوا۔ پورے شہر میں بھگدڑ مچی۔ ایک بھیا پاکستان چل دیے۔ ایک

نگے ہی فارن میں تعلیم حاصل کرنے چلے گئے تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ خاندان کے جڑے ہوئے لوگ ٹوٹی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرے جا رہے تھے۔ نہ دماغی چین تھا۔ نہ جسمانی آرام۔ ہوا یہ کہ نتیجہ میں ہم بہنوں کو اسکول سے اٹھا لیا گیا۔

"کیا میں یوں ہی جاہل رہ جاؤں گی؟" یہ سوال رہ رہ کے میرے مجروح دل اور دماغ کو کچوکے دیتا۔ مجھے تو تعلیم حاصل کرنے کا بچپن ہی سے اتنا شوق تھا کہ جہاں دوسری بہنیں گڑیاں اور ہنڈکلیا کھیلا کرتیں میں محلے کے بچوں کو لے کر اسکول اسکول کھیلا کرتی۔ پھر اللہ میاں کا یہ ستم کیسا تھا؟ نانی اماں سمجھاتیں:۔ "بیٹا تم لوگ سیدھو۔ اللہ کے پیارے۔ اور اللہ انہی کو آزمائش میں ڈالتا ہے جو اُسے پیارے ہوتے ہیں!"

اللہ میاں سے اسی مارے بچپن سے ٹھنی رہی۔ نماز آج بھی پنج وقتہ پڑھتی ہوں۔ ہمیشہ نماز پڑھ کر یوں محسوس ہوا گویا اللہ پر احسان فرمایا ہے۔ "دیکھ لیا نا آپ تو ہمارے لئے کچھ نہیں کرتے مگر ہم آپ کے حضور سر جھکائے جاتے ہیں۔"

نانی اماں حج کر آئی ہیں۔ جب کبھی خدا کو بُرا کہا انہوں نے کان پکڑوا کر توبہ کروائی اور گناہوں کی معافی خود مانگی۔ مگر اللہ میاں کو "ناانصاف" کا خطاب جو میں نے بچپن میں دیا تھا کبھی واپس نہ لیا۔

بس فیس میں دیر ہوئی تو اسکول کی بس آنی بند ہوئی۔ کلاس فیس میں دیر ہوئی تو پہلے کلاس باہر، پھر اسکول باہر۔ چلئے قصہ ختم۔ میٹرک، پھر ایف۔ اے، پھر بی۔ اے اور اب ایم۔ اے سب پرائیویٹ۔ پڑھانے والا کوئی نہیں۔ کبھی ایک مہینے تک کے لئے بھی کسی کی ٹیوشن نہ لی۔ جو پڑھا، دل سے پڑھا۔ امتحان دیا، پاس ہوئے اور خدا کا شکر بجا لائے۔

ایف۔ اے کا امتحان جیسے دیا، دل ہی جانتا ہے۔ نہ کتابیں تھیں، نہ کھانے کو تھا۔ ان دنوں راشن سے چنے اور پکی ہوئی کھجوریں ملتی تھیں۔ جن کے پاس تھا وہ تو خرید کر بلیک سے اناج حاصل کر بھی لیتے، ہم جیسے کہاں سے لاتے؟ جس دن امتحان دینے چلی یہ حال تھا کہ پیٹ میں اناج کا دانہ تک نہ تھا۔ کتابیں بھی نہ مل سکی تھیں۔ معاشیات کا پرچہ تھا۔ جو لکھا تھا آج بھی یاد ہے۔ سوشیالوجی کا پرچہ بھی یوں ہی کیا۔ پورے پرچے میں اشعار، سرمایہ داری کو گالیاں، ایک آیا قریب سے گزریں اور سوشیالوجی کے پرچے میں شعر لکھا پایا تو جھک کر پڑھا، ہنس کر بولیں:۔

"کمیونسٹ ہو گیا؟"

میں جل کر بولی تھی :۔ "تن پر کپڑے نہ ہوں، پیٹ میں روٹی نہ ہو اور کوئی کہے کہ میں ننگا ہوں، بھوکا ہوں اور آپ اسے کمیونزم کہتی تھی تو بے شک میں کمیونسٹ ہوں۔"

نتیجہ آیا۔ آج تک حیرت ہوتی ہے میں پاس کیسے ہوئی !!

(وہ نامِ نہاد سورج، جس کے دم سے روشنی کا تصور قائم ہے، کبھی میرے آسمان پر نہ چمکا۔)
میں نے جب کبھی آنکھیں اٹھا کر آسمان کو دیکھا وہاں گھٹائیں تنی ہوئی دکھائی دیں) بی۔ اے کے وقت بھائیوں نے کہا" اردو بھی کوئی لینے جیسی چیز ہے۔ اکنامکس MAIN لو تاکہ کچھ قدر بھی رہے۔" بھکاوے میں آ گئی۔ جس وقت کوسچن پیپر بانٹنے کی بیل بجی اور پروفیسر نے کہا:۔

"جس جس کا اکنامکس میں ہو کھڑی ہو جائیں۔" تو پورے ہال میں صرف ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ بھی ایک پرائیویٹ کینڈیڈیٹ — اور وہ میں تھی۔

یہ میری زندگی کی پہلی شکست تھی۔ پہلی تعلیمی شکست۔ میں آج تک کبھی فیل نہ ہوئی تھی۔ بچپن سے اب تک ہمیشہ اونچے نمبرات لئے تھے۔ اتنا غم ہوا کہ آنکھ نم بھی نہ ہوئی۔ مگر اس میں کیا میری اپنی ذہانت کا قصور تھا؟ مجھے تو ڈھنگ کی ایک کتاب بھی نہ مل سکی۔ پڑھنے والے بھلے ہی یقین نہ کریں، مگر میں نے زندگی میں کون بات جھوٹ کی ہے؟؟ دوسری بار پھر بی۔ اے میں بیٹھی۔ پھر لڑھکی۔ میرے خدا! "مجھ میں ہمت بہت ہے۔ کم از کم تعلیم تو ضرور پوری کروں گی اپنی۔" میں نے دل کو اپنے سنایا۔ ان دنوں کی بات بتاؤں، تن پر صرف ایک جوڑا ہوا کرتا تھا۔ بھائیوں کی قمیص، پتلون پہن، میم صاحب بنی، وہ جوڑا دھوتی اور پھر امتحان دینے مرنے سے ' ڈھلی ڈھلائی ساری پہن کر جاتی۔ غریبی کے داغ کس نے دیکھے ہیں —؟!

اچھی طرح یاد ہے، صبح پرچہ تھا، رات کو ہم لوگ بھوکے ہی سو گئے تھے۔ اچانک وطن سے بھائی آ پہنچے۔ یہ بھائی بڑے ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔ آتے ہی کہا :۔

"بڑی بھوک لگ رہی ہے، کھانا لاؤ۔"

میں رضائی سے چہرہ باہر نکالے چھت کو دیکھتی پڑی تھی۔ ان کی بات سن کر میں نے چہرہ بھی رضائی میں چھپا لیا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ پھر جانے کیا سمجھ کر اٹھے اور باہر نکل گئے۔ باہر سے آئے تو ہاتھوں میں کیک پیسٹری اور سالٹی اسنیکس کے پیکٹ تھے۔ میں

نے آہٹ پاکر آنکھیں کھولیں۔ اُنھیں لگا پہلے دیکھا تو بپھرے ہوگئی۔ صبح میری آنکھیں خون رنگ تھیں۔ سب کہتے ہیں میں اپنی ماں پر گئی ہوں۔ میرا رنگ سانولا ہے مگر اس صبح میں نے آئینہ دیکھا تو چہرہ زرد چاند ہو رہا تھا۔

میں نے امتحان دیا۔ نتیجہ آیا۔ پاس بھی ہوگئی۔ زندگی کی کافی بڑی تمنا تھی کہ گریجویٹ ہو جاؤں۔ ہو بھی گئی، مگر دل کو جیسے گھن لگ گیا۔ زندگی سے دل بھر گیا۔ ہر وقت روتی رہتی۔ دو ایک بار خودکشی کی کوشش کی۔ ایک بار زہر کی بوتل منہ تک لے بھی گئی، مگر افروز (میری چھوٹی بہن — میری دوست۔) نے دیکھ لیا۔ روتے روتے آنکھیں دھندلا گئیں۔ میرے انتہائی لمبے لمبے بال، جن کی وجہ سے میں بچپن میں چڑیل اور پھر بعد میں "لمبے بالوں والی ولیدہ" کے نام سے مشہور تھی، جھڑ جھڑا کر ڈیڑھ ہاتھ کے رہ گئے۔ کھانسی رہنے لگی اور وزن دن بہ دن گھٹنے لگا۔ نانی اماں ایک دن ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے صاف کہہ دیا:۔

"اگر بیٹا کے علاج پر توجہ نہ دی تو خطرہ ہے۔ یہ راستہ ایک خطرناک گھاٹی میں جاکر ختم ہوتا ہے۔" نانی اماں سہم گئیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا "مرغی کے پوزوں کا سوپ پلائیے۔ پھل دیجیے۔ دودھ پلائیے — اور — اور — اور —" اب میں آپ سے بتا رہی ہوں کہ ڈاکٹر نے ٹانک اور گولیاں لکھ کر دیں۔ غذا کے بعد۔ مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ ٹانک غذا کے بعد لوں یا پہلے۔ ان دنوں ہمارے یہاں کبھی کبھار ہی کھانا پکتا تھا۔ پہلے یا بعد کا سوال ہی باقی نہ رہ جاتا تھا۔ وہ ٹانک اور گولیاں بدستور پڑی رہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ہی، افروز اور اپی مل کر گھر کی صفائی کر رہی تھیں تو میں نے وہ ٹانک اور گولیاں پھینک دیں۔ (مگر ان یادوں اور آہوں کو نہ پھینک سکی جو استنے دنوں سے دل کو چھیدے ہوئے ہیں۔)

ان ہی دنوں دلی سے ایک ویکلی "آئینہ" شائع ہونے لگا۔ اس میں ایک مستقل عنوان ہوا کرتا تھا "میری یادداشت ہے" اس کے تحت کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ اپنی یادداشت سے چن کر لکھنا پڑتا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ایک دن یوں ہی وہ واقعہ لکھ ڈالا جو مجھے انٹر کا امتحان دیتے وقت پیش آیا تھا۔ اس دن مجھے ایسا سکون ملا جو میں کبھی لفظوں میں بیان نہ کر سکوں گی۔ اس احساس کو، اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے شاید مجھے نئے الفاظ وضع کرنے پڑیں گے، جو میرے اپنے بس کا روگ نہیں۔ اس رات جب وہ روداد لکھنے کے بعد میں اپنے بستر پر لیٹی تھی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں،

جو ایک مدت سے کڑی دھوپ میں چلتی آرہی ہوں آج ٹھنڈے سائے تلے آگئی ہوں۔ !!

یوں میری افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔

میرے اپنے ذاتی دُکھ کے علاوہ بھی کئی واقعے اور حادثے ایسے تھے جنہوں نے میرے دل کو کرچی کرچی کر رکھا تھا۔ اب میں بڑے انہماک سے انہیں لفظوں کا روپ دیتی اور چھپوانے کو بھیج دیتی۔ ابھی میری چند کہانیاں ہی چھپی ہوں گی کہ ایکدم سے جیسے تہلکہ مچ گیا۔ اپنی علطیوں کا ذکر میں یہاں نہیں کر رہی ہوں، اپنے خاندان والوں کی بات سُنا رہی ہوں۔ ممکن ہے آپ سوچیں کہ خاندان والے اب اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتے جتنی گنا رہی ہوں، مگر یہ سوچئے! ہم آٹھ بہن بھائیوں کو نانی اماں نے پالا۔ اکیلی جان اور آٹھ وجود۔ اماں باپ مرے اس وقت سب سے بڑی اولاد دس برس کی تھی۔ اتنے سارے روتے کلپاتے بچے، جن کی تعلیم تربیت، دُکھ درد، اچھے بُرے میں بس نانی اماں ہی نانی اماں تھیں۔ کوئی کسی کا سنگی ساتھی نہیں ہوتا اس لئے میں خواہ مخواہ رشتے داروں، خاندان والوں کو یہ کہہ کر شرمندہ کیوں کروں کہ انہوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا! ہر انسان کی اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے اور اس کے اعمال اس کے اپنے ساتھ۔ کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ کسی کا ساتھ دے، اس کی قسمت بنائے۔ مگر نانی اماں خاندان والوں سے یوں ڈرتی تھیں کہ اگر کل کلاں کو ہم جاہل رہ جاتے اور بُری صحبت میں پڑ کر ناکارہ ہو جاتے تو یہی خاندان والے طعنے دیتے کہ "دیکھا! کیسے اولاد کی تربیت کی ہے۔؟" اس ایک طعنے سے بچنے کے لئے نانی اماں نے کیا کیا جتن نہ کئے۔؟ (نانی اماں خدا بخشے مگر میں نے انہیں سجدے کئے ہیں!) تو جناب میں آپ سے بتا رہی تھی کہ اب اِدھر اُدھر جو دو چار میری کہانیاں چھپیں تو گویا زلزلہ ہی آگیا۔!

"واجدہ بیگم نے تو عصمت کو بھی مات دے دی۔"

"ارے یہ افسانے کہیں شریف بہو بیٹیوں کے پڑھنے کے لائق ہیں؟"

"اس کے افسانے تو شادی شدہ عورتیں بھی نہیں پڑھ سکتیں۔"

"دیکھنا ایک دن باپ کی ناک کٹوا کے رہے گی۔"

"میری بیٹی ایسے افسانے لکھتی تو اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیتی۔"

یہ مقدمے دھیرے دھیرے نانی اماں کی عدالت میں آنے شروع ہوئے۔ پہلے تو بات دبی دبی سی رہی، پھر زور شور سے میرے خلاف محاذ بننے لگا کسی سلسلے میں نانی اماں دلّی گئیں، وہاں

لوگوں نے خوب کان بھرے۔ واپس آئیں تو نانی اماں مجھ سے سخت برہم تھیں۔

ان ہی دنوں میری کہانی "تین جنازے" چھپ کر آئی تھی۔ نانی اماں پرچہ لے کر آئیں اور ڈٹ گئیں کہ "میں تو یہ کہانی ضرور سنوں گی۔ بتا تو کیا لکھتی ہے؟" کہانی آپ کے سامنے ہے، بتائیے بھلا میں یہ کہانی سنا سکتی تھی؟ میرا قصور یہ تھا کہ میں نے اس بپتا حقیقت کو کہانی کا رنگ دیا۔ اب میرا کام یہ تو نہ تھا کہ کہانیاں سناتی پھرتی۔ میرے نہ سنانے پر نانی اماں کو شبہ ہو گیا، بلکہ یقین ہو گیا کہ یقیناً "ایسی ویسی" کہانیاں یہ لکھتی ہے، تب ہی تو سنا نہیں سکتی۔ میں نے گھبرا گھبرا کر اپنے ڈیفنس میں کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ اب جناب یہ مصیبت کہ جہاں میں نے قلم کاغذ ہاتھ میں لیا نانی اماں آموجود ہوئیں۔ "بتا کیا لکھ رہی ہے؟ سنا کیا لکھ رہی ہے؟" نانی اماں پڑھی لکھی نہیں ہیں، مگر انہیں چلا دینا بڑا مشکل کام ہے۔ اگر میرے ہاتھوں میں لمبا چوڑا کاغذوں کا پلندہ ہے اور میں نے کہہ دیا کہ خط لکھ رہی ہوں تو وہ کبھی یقین نہ کریں گی۔

"خط اتنے بڑے بڑے لکھے جاتے ہیں؟ ضرور کہانی لکھ رہی ہے"

اب مصیبت یہ رہی کہ ایڈیٹروں کے جو خط آتے اور جاتے، سب کچھ نانی اماں سنا کرتیں۔

محترمی ایڈیٹر صاحب

آپ نے کہانی مانگی ہے۔ اس وقت تو نہیں ہے، جب لکھوں گی فوراً بھجوا دوں گی۔

"کیا لکھا — جب لکھوں گی!؟ مگر یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟؟"

پھر کسی ایڈیٹر کا خط آ گیا کہ کہانی مل گئی۔ ارے کمبخت مل گئی تو اطلاع دینا کون ضرور تھا۔

لیجئے اب نانی اماں سن رہی ہیں۔

"کہانی مل گئی۔ آپ نے کمال کر دیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب آپ آسمانِ ادب کا سورج بن کر چمکیں گی۔"

"یہ کہانی کب بھجوائی تھی؟"

یہ کڑا محاسبہ — ! بخدا زندگی اجیرن ہو گئی۔ میں نے دل کڑے۔ حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ "اب سے کبھی کوئی چیز نہ لکھوں گی۔ کون یہ جوکھم مول لے۔ کوئی زندگی سی زندگی ہے!"

کئی دن گزر گئے، میں نے کچھ نہ لکھا۔ ایک دن ایک ماموں تشریف لائے۔ پامسٹری سے بڑا لگاؤ ہے انہیں۔ میرا ہاتھ دیکھا پہلے تو خاصی بکواس فرماتے رہے پھر سیریس ہو کر بولے:-

"اری سچ ملکہ تیرے ہاتھوں میں ایک خاص بات ہے۔ تجھے ضرور شہرت ملے گی۔ اور بہت ملے گی۔"

میں نے آزردہ ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "ماموں میرا دل نہ جلائیے۔ ہاتھ آیا تو موقع کھو گیا، اب کون شہرت کا لمک ہے۔"

اس شام نانی اماں کہیں مہمان گئیں تو میں اپنی قسم بھول گئی اور ایک کہانی فوراً لکھ ڈالی۔ "آگ میں پھول" لفافے میں بند کر کے رکھ بھی لی۔ دوسرے دن چوری سے نوکر کے ہاتھ میں لفافہ دیا تو جانے کیسے نانی اماں کی نظر پڑ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ ڈپٹ کر بولیں۔

وہ جھوٹ کیوں بولتا۔ ؟ صاف کہہ گیا۔ "ملکہ بی بی نے کہت دیے۔ بولے غپ چپ ڈال کو آجا۔"

اس کمبخت "غپ چپ" نے وہ آگ لگائی کہ پوچھیے نہیں۔ دوسرے ہی لمحے آنگن میں آگ اور پھول بکھرے نظر آ رہے تھے۔ میرے خدا !!

میں سہم کر رہ گئی — بزدل لڑکی۔

پھر ایک پھوپھی آئیں۔ میرا ذکر بیچ میں آیا۔ میرا نام زیر بحث آیا۔

"اچھا تو اس کا نام واجدہ تبسم ہے۔"

ابو نے میرا نام واجدہ بیگم رکھا۔ امی کو جانے مجھ میں کیا ادل ہونے کے آثار نظر آئے کہا میں تو اپنی اس بیٹی کا نام ملکہ رکھوں گی۔ بچہ ماں کا زیادہ ہوتا ہے، باپ کا کم۔ امی کا رکھا نام چل نکلا۔ بگڑا تو کسی نے ملکو کہنا شروع کیا، کسی نے کی اور کسی نے ملکی۔ مگر جب اسکول میں داخلے کی نوبت آئی تو ابا والا نام لکھا گیا۔ "واجدہ بیگم" مگر جب میں نے لکھنا شروع کیا تو خود کو واجدہ تبسم بنا لیا۔ صاف سیدھی بات ہے، زندگی نے مجھے غم ہی غم دیے، میں اپنی زندگی میں مسکراہٹیں بھر لینا چاہتی تھی، اور یہی کیا میں۔ اس طرح خود میرے خاندان میں پہلے پہل بہت کم لوگوں کو پتہ چلا کہ میرا ہی نام "واجدہ تبسم ہے"۔

باتوں باتوں میں "تین جنازے" کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگیں :-

"یہ کہانی تم نے ہی لکھی ہے نا؟"

میں ڈر کر صاف جھوٹ بول گئی :- "جی نہیں وہ تو فکر تونسوی نے لکھی تھی۔"

جس زمانے میں شاہراہ میں وہ کہانی چھپی اُسے فکر صاحب ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ گھبراہٹ میں جو منہ سے نکلا وہی کہہ گئی۔ "مگر کہانی پر نام تو تمہارا دیا ہوا ہے۔؟"

اب کہ میں بہت معتبر انداز سے جھوٹ نبھانے لگی۔

"دیکھئے نا دراصل ہوتا یوں ہے" میں نے اس قدر اُلٹ پلٹ باتیں کیں کہ بعد میں خود اپنی بے بسی پر مجھ کو رونا آگیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں اپنی کہانی کو اپنی نہیں کہہ سکتی تھی۔ دل کا سارا غبار آنکھوں کے راستے نکل پڑا۔ جاتے جاتے جب وہ سمجھانے لگیں تو یہ بھی کہا:۔

"دیکھو بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کی کہتے ہیں۔ تمہارا خاندان دیکھو ....."

ابھی وہ کچھ کہتی ہی تھیں کہ اکدم واجدہ زور سے بول پڑی:۔

"کٹے گی تو میرے باپ کی ناک کٹے گی۔ آپ کا کیا بگڑے گا؟ جب میرا باپ مرا تھا اور نانی اماں اکیلی رہ گئیں تھیں، تب آپ کو ہمارے بھلے کی نہ سوجھی۔ اب ہم کسی قابل ہوئے ہیں تو آپ کیوں اپنا سکّہ جتانے آن پہنچی ہیں؟"

وہ یقیناً میں نہ تھی، واجدہ تھی، جو ایک کہانی کہنے والی تھی! جو اپنے مستقبل کے لئے جدوجہد کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ مجھے اعتراف ہے کہ میں جو ہوں تو ایک بہت ہی بزدل لڑکی ہوں۔ ہاں جناب! اس دن ڈول چھلکا، اور ایسا چھلکا کہ پھر کسی نے میرے سامنے کچھ نہ کہا۔ مگر میرے پیچھے تو کہتے ہی رہے، وہ بھی جو کہنا چاہئے، اور وہ بھی جو نہ کہنا چاہئے۔

(میں پہلے واجدہ تھی۔ پھر تبسم بنی۔ مگر اس ایک مسکراہٹ کے لئے کتنے آنسو میری آنکھوں سے ٹپکے۔؟)

ایک بار ایسے ہی کسی موقعے پر میں نے ایک اور نام نہاد عزیز سے کہا تھا:۔

"جی آپ تو آپ ہیں، اگر قبر سے میرا باپ اُٹھ کر آجائے تو بھی میں افسانے لکھنا نہیں چھوڑوں گی۔"

یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ یہ ساری باتیں کافی پہلے کی ہیں۔ اور جو پہلے ڈرتے تھے کہ واجدہ خاندان کی، رشتہ داروں کی ناک کٹا دے گی، اب میرے پیچھے اپنے ملنے والوں سے فخریہ کہتے پھرتے ہیں کہ "ارے وہ۔ واجدہ تبسم! میری بھتیجی ہے۔ بڑی ہونہار لڑکی ہے۔ ہاں ہاں وہ واجدہ نا۔ میری عزیز ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں لکھ رہی ہے۔ اس کے باپ تو میرے

دوست تھے۔ خاندان کا نام روشن کر دیا بٹیا نے۔"

آپ یقین کریں مجھے ان باتوں سے نہ خوشی ہوتی ہے نہ فخر محسوس ہوتا ہے۔ رنج بھی نہیں ہوتا، غصہ ضرور آتا ہے۔ اور میں تو بچپن ہی سے تنگ مزاج ہوں۔ بس جی چاہتا ہوں جو لوگ میرا نام لے لے کر فخر محسوس کرتے ہیں ان سے کہہ دوں :۔

" معاف کیجیے آپ سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

پہلے کے مقابل اب حالات کافی بدل چکے ہیں، مگر پھر بھی نانی اماں مجھ سے تھوڑی بہت بدگماں ضرور ہیں۔ انہیں ایک شکایت یہ ہے کہ میں انہیں اچھی کہانیاں نہیں سناتی۔ اور صاف سیدھی بات تو یہ ہے کبھی اپنا بوتا نہیں جو نانی اماں کو کہانی سنا سکیں۔ ایک بار، بار بار کے کہنے پر، اقرور نانی اماں کو کہانی سنانے بیٹھی۔ اس میں لفظ محبت اس انداز سے آیا کہ نانی اماں گڑبڑا گئیں۔

"ہیں کیا پڑھا؟ محبت۔ کس کو محبت۔ کس سے؟ اچھا تو یہ بات ہے۔ یہ عشق عاشقی کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔۔۔ ہوں تو یوں کہو۔"

اسی لئے کہانیاں سب سے چھپ کر لکھتی ہوں۔ ایک بے حد تاریک اور اندھیارے کونے میں۔ اگر آنگن سے ہوکر کوئی کمرے میں آئے تو دکھائی بھی نہ دے سکتا کہ کونے میں کوئی متنفس بھی ہے۔ بانو (جیلانی بانو) جب پہلی بار مجھ سے ملنے میرے گھر آئی تو اس نے وہ جگہ دیکھنی چاہی، جہاں بیٹھ کر میں "ادب تخلیق" کیا کرتی تھی۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ ایسی واہیات جگہ بیٹھ کر کوئی سانس بھی لے سکتا ہے۔ مگر جب میں نے اسے ٹوٹا ہولڈر، زنگ آلود چاقو، چھوٹی سی دوات، لال اور نیلی پنسل کا ٹکڑا اور تازے آئے ہوئے رسالوں کے ساتھ فرش پر بے شمار سیاہی کے چھینٹے پڑے ہوئے دکھائے تو اسے یقین کرنا پڑا۔ گھر جا کر اس نے لکھا تھا:۔

" دوچندا۔

میرا مشورہ ہے کہ تم اس کونے سے نکل کر آسمان تلے آجاؤ۔ اگر سورج کا اجالا بھی تمہاری کہانیوں میں آجائے تو کیا کہنے!"

میں نے اس سے کہا تھا:۔

"میں کسی سورج کے مرہون منت نہیں ہونا چاہتی۔ میں خود سورج بن کر اس کونے

کو منور کر دوں گی۔" سورج بن جانے کی یہ تمنا میرے دل میں آج بھی موجود ہے۔ بانو کے علاوہ اور بھی بہتوں نے مجھ سے یہ بات کہی ہے۔ میں صرف گھریلو کہانیاں لکھتی ہوں۔ میری کہانیوں میں کوئی خارجی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آخر دنیا میں اور بھی تو موضوع ہیں ــ!

یہ بات نہیں کہ مجھے عورتوں کا ایسی کہانیاں لکھنا پسند نہیں جن میں کسی بڑے اہم موضوع کو سمیٹا گیا ہو۔ جیسے امن، جنگ، ہڑتال۔ یہاں کسی موضوع کی قید نہیں۔ ہزاروں موضوع اور مسائل ایسے ہیں جن پر لکھا جا سکتا ہے۔ مگر میں یہ کہتی ہوں کہ اگر ہم گھر میں بیٹھ کر چولہا ہانڈی کرنے والی عورتیں، جنہوں نے بازار کی شکل تک نہیں دیکھی، یوں ایسی کہانیاں لکھنے لگیں جن میں امن کا ذکر ہو، کسی جنگ کی تفصیل ہو یا کمیونزم یا کسی اور ازم کا پروپگنڈہ ہو تو کس قدر غلط سی بات ہو گی۔ یہ بات طے ہے کہ آپ اس وقت تک کسی مسئلے پر کامیابی سے نہیں لکھ سکیں گے جب تک کہ آپ نے مسئلے سے متعلق گہری واقفیت حاصل نہ کر لی ہو۔ اگر میں یہاں حیدر آباد دکن میں بیٹھ کر کراچی کے فرشوں پر کوئی کہانی لکھنا چاہوں تو کیسی بھونڈی بات ہو گی! میں کسی کے میدان کو محدود نہیں کرنا چاہتی صرف اپنے متعلق کہہ رہی ہوں کہ میں ایسے کردار کبھی نہیں چنوں گی جن کے بارے میں مجھے کچھ بھی علم نہ ہو۔ کرشن چندر، ساگر کی پتّی کا پل، ایسی کہانی بڑی خوبصورتی سے لکھ سکتا ہے، کیونکہ اس نے نہ صرف بمبئی دیکھی ہے، بلکہ وہ مرد ہے اور اس نے باہر کی سیر بھی کی ہے۔ ایسے میں اس کے قلم سے جو کہانی نکلے گی بڑی پختہ ہو گی۔ کوئی بات ایسی نہ ہو گی جس کے متعلق کہا جا سکے کہ۔ "مسٹر آپ نے بمبئی کی گلیاں دیکھی ہیں؟ کبھی نعرے لگاتے ہوئے جلوسوں کے ساتھ گھومے ہیں؟" برخلاف اس کے اگر آپ کرشن سے پوچھیں کہ "بریانی میں کتنی سرخ مرچیں ڈالتے ہیں؟" تو یہاں ان کے "مشاہدے اور تجربے" کی پول کھل جائے گی۔ آپ جانیں بریانی میں مرچ تو پڑتی ہی نہیں ہے! کرشن بریانی نہیں پکا سکتا۔ میں ساگر کی پتّی کے پل پر کوئی کہانی نہیں گھڑی کر سکتی، کیوں کہ ہم دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ خود اپنے سے بھی، اور پڑھنے والوں سے بھی، یوں بے ایمانی کر کے فائدہ ہی کیا ہے؟ کیا اس سے اچھا یہ نہیں ہے کہ ہم صرف انہی موضوعات پر قلم اٹھائیں جن کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور ہمارے دل کو یہ دھڑکا بھی نہیں لگا رہتا کہ کہیں ہم ادب کے نام پر دھوکہ بازی تو نہیں کر رہے ہیں ـــ؟

لوگ مجھ سے کہتے ہیں، "تم کب تک گھر کی چہار دیواری میں بیٹھی رہو گی؟ باہر نکلو۔ دنیا

میں گھوم پھر کے دیکھو کیا ہو رہا ہے اور پھر ایسی اچھی کہانیاں لکھو۔ تمہاری کہانیوں میں تو آ جا کے وہی ایک سی باتیں ہیں۔" چلیے مان لیا کہ میری کہانیوں میں وہی ایک سی باتیں ہیں۔ مگر ذرا یہ بھی سنیے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں ہوش و حواس کے عالم میں، ریل میں پہلی بار، ۱۹۵۲ء میں بیٹھی ہوں۔؟؟ پارٹیشن کے وقت تو پتہ نہیں کیسے ہم حیدرآباد تک آ پہنچے، مگر جہاں تک ہوش و حواس کا سوال ہے میں نے ریل کی شکل صرف تین سال پہلے دیکھی ہے۔ یہ سوال آپ کو قطعی غیر ضروری نظر آئے گا۔ مگر آپ یوں بھی تو سوچیں کہ وہ لڑکی، جو خود کو بڑھیا کہتی ہے، جو پہلی بار بڑھاپے میں ریل میں بیٹھی ہو، وہ دنیا کے متعلق کیا سوچ سکتی ہے؟ کیا لکھ سکتی ہے؟ شاید ریل میں بیٹھنا نصیب ہوتا بھی نہ، مگر بھیا کی شادی ناگپور میں ٹھہری، برات لے کر تو جانا ہی تھا۔ میں نے پلیٹ فارم کے بارے میں بڑے بڑے اندازے لگا رکھے تھے، لیکن جب دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی۔ "ارے بس اسی واہیات سی چیز کے اتنے ڈھنڈورے تھے! پلیٹ فارم ایسا اور پلیٹ فارم ویسا، خاک بھی گلیمر نہ تھا کم بخت میں!" اب ریل میں بیٹھی ہوں تو یہ عالم ہے کہ مارے ڈر کے دم نکلا جا رہا ہے۔ کیوں ریل پل پر سے گزر رہی ہے۔ کھڑ کھڑ دھڑ دھڑ کی وحشت ناک آوازیں!! اور مجھے ہر لمحہ یہ ڈر محسوس ہو رہا ہے کہ بس ابھی ابھی ریل پانی میں گر پڑے گی۔ قریب بیٹھا ہوا ایک کرسچن جھلا کر بولا: ۔

OGOSH! THE MOST COWARD CREATURE I'VEEVER SEEN!" ("اوگوش۔ دی موسٹ کاورڈ کریچر آئی ہیو ایور سین!")

جس لڑکی کے بارے میں ایک غیر ملکی یہ ریمارک پاس کرتا ہے، اُس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ باہر کی دنیا پر کہانیاں لکھے۔؟؟ !!!!۔ یہ ہم سے نہ ہوگا۔ ایسا کیا ہم مرے جا رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا اور دنیا کو گھوم پھر کر دیکھیں گے، تب لکھ لیں گے ایسی کہانیاں۔ جب مرنے کا سیزن تھا تب تو نہ مرے، اب کیا مریں گے؟ اب تو جینے کے دن آ رہے ہیں۔

ویسے آپ یقین مانیے آپ میں سے کوئی میری کہانیوں کو بُرا کہتا ہے تو مجھے ذرا بھی دُکھ نہیں ہوتا۔ (اور آپ میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے میری کہانیوں کو بُرا کہا ہے۔) اگر آپ اچھا کہہ دیتے ہیں تو خوشی بہت مل جاتی ہے۔ اور یہ خوشی مجھے یوں ملتی ہے کہ میں نے جن کرداروں کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے انھوں نے کسی نہ کسی طرح آپ کو متاثر ضرور کیا

ہے۔ ایسے میں میں اس دکھ اور کرب کو بھول جاتی ہوں جو کہانی لکھنے سے پیش آیا تھا! (میں نے آپ سے کہا ہے ناکہ مجھے کہانیاں لکھنے میں کسی قسم کی "محنت" نہیں کرنی پڑتی۔ میں نے اپنی طویل سے طویل کہانیاں بھی ایک ہی SITTING میں لکھی ہیں!) "شہرِ ممنوع" میری وہ کہانی ہے جس کے کردار مجھ سے، میری زندگی سے، میرے دل سے سب سے زیادہ قریب ہیں یہ کہانی میں نے بڑی مشکل سے لکھی ہے۔ آپ میرے دکھ کا اندازہ شاید نہ لگا سکیں کہ جب یہ کہانی لکھ رہی تھی میرا دل کیسے کیسے روتا تھا، پڑھنے والوں نے مجھ سے کہا ہے کہ "ایسی کہانی شاید اب تم کبھی نہ لکھ سکو گی۔" (مگر مجھے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ غمناک اور خون رلانے والی کہانی جو محسوس ہوتی ہے وہ "گلستان سے قبرستان تک" ہے۔)

"کالے بادل" لکھتے ہوئے میں جس کرب و امتحان سے گزری اس نے مجھے تین چار راتوں تک سونے نہ دیا۔ پیسہ کتنی حقیر شے ہے، مگر پھر بھی اس کو سجدے کئے جاتے ہیں۔ لیکن عجیب و غریب بات ہے خدا نے خود ہی انسان کو پیدا کیا اور خود ہی ان کی زندگی میں غم ہی غم بھر دیئے! ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اس دنیا میں کس لئے بھیجے گئے ہیں؟ یہ سب باتیں سوچتے سوچتے کبھی کبھی میں PAGAN ہونے لگتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں اگر میں خدا ہوتی تو۔۔؟؟ شاید میں دنیا کو اتنی تباہ حال نہ رکھتی۔ میں سمجھتی ہوں حالات سے مغلوب ہو کر ہر دکھی دل ایک نہ ایک بار خدا بن جانے کے بارے میں سوچتا ضرور ہو گا۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ بڑی بات ہے جو میں خدا نہیں ہوں، ورنہ مجھے ایسے دکھی دلوں کی اتنی باتیں سننی پڑتیں کہ ہوتے ہی دن آسمان سے اتر آتی اور سیدھی سادی واجدہ تبسم بن جاتی۔ مگر انسان بن کر تو کہیں جائے فرار نہیں۔ اس دنیا میں اپنی اپنی جملہ محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود رہنا ہی پڑتا ہے، جینا ہی پڑتا ہے مسکرانا ہی پڑتا ہے۔

تو میں یہی کہہ رہی تھی جناب کہ مجھے لکھنے میں محنت تو نہیں کرنی پڑتی، ہاں شدید کرب سے اکثر گزرنا پڑتا ہے۔ "شہرِ ممنوع" "گلستان سے قبرستان تک" "اتن اس شہزادہ" — "کالے بادل" — "پاندان" "بیگناہوں کی راتیں" — "آگ میں پھول" — یہ اور ایسی کتنی ہی کہانیاں — کہانیاں نہیں جیتی جاگتی حقیقتیں تھیں جنہیں میں نے لفظوں کا جامہ پہنایا اور آپ نے کہانیوں کا نام دیا۔

۲۱ ستمبر چھپن کو میری پہلی کہانی چھپی تھی۔ اور اب تیرہ سال بیت گئے ہیں۔ ان تیرہ سالوں میں داد بہت ملی، "بے داد" کچھ نہیں۔ خودستائی نہیں کر رہی ہوں، لیکن جانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ جانتی ہوں کہ میں نے ابھی کچھ نہیں لکھا ہے، کچھ بھی نام پیدا نہیں کر سکی ہوں، لیکن سوچتی ہوں ناکامی کی اینٹوں سے ہی تو کامیابی کا محل کھڑا ہوتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو اتنی ساری کٹھنائیاں اور مصیبتیں جھیل کر بڑھتے چلے آنے کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔ اور یہ یقین پختہ ہونے لگتا ہے کہ اب میں زندگی سے کبھی ہار نہیں مان سکتی۔

سہی آپ کی یہ بات کہ مجھے اور دوسرے موضوعات پر بھی لکھنا چاہئے۔ تو میں آپ سے بتاؤں، دنیا کو قریب سے دیکھنے اور گھومنے پھرنے کی تمنا پوری ہو جائے، میں آپ کی خواہش کا ضرور احترام کروں گی۔ ابھی ابھی تو ایک پنچھی نے اڑنا سیکھا ہے، اگر آپ ابھی سے اس سے یہ توقع کرنے لگیں کہ وہ آسمان تک پرواز کرنے لگ جائے تو بے چارہ تھک کر زمین پر نہ آپڑے گا۔!!

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ "عجیب ہے یہ لڑکی بھی۔ اپنے تعلق سے جو کچھ کہلوانا تھا، سب خود ہی کہہ ڈالا۔" جی ہاں بس میں یہی نہیں چاہتی کہ کوئی میرے متعلق وہ سب کچھ کہے جو بہت ہی نارمل ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں 'پیش لفظ' کی وبا بہت عام ہو رہی ہے مجھے ہمیشہ سے پیش لفظ پڑھنے سے چڑ رہی ہے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح قاری کی رائے ہمیشہ متاثر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی نہج سے الگ ہٹ کر سوچنے لگتا ہے۔ اور یوں قاری کی بات جانے بھی دیجئے تو مجھے سرے سے یہ سلسلہ ہی ناپسند ہے۔ یہی آخر کیا ضرور ہے کہ ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر کسی نہ کسی "بڑے آدمی" کے نام کا لیبل بھی ضرور لگا ہو! میں نے تو اس "روایت" کو بھی روا نہیں رکھا ہے جو ڈسٹ کور پر بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی طرف سے چپکا دی جاتی ہیں۔ ویسے آپ یقین مانیں کہ میرے پاس کئی "بڑے لوگوں" کے ایسے ایسے خط موجود ہیں جن میں میری افسانہ نگاری کے تعلق سے بڑی خوبصورت باتیں کہی گئی ہیں۔ یوں بھی میرے آس پاس اتنے سارے شفیق اور مہربان چہرے موجود ہیں کہ ان سے اگر جھوٹوں بھی "کچھ" لکھنے کو کہہ دیتی تو بلا مبالغہ وہ ایک طویل سا پیش لفظ میرے لئے لکھ دیتے۔ لیکن مجھے اس تصور سے ہی الجھن ہوتی ہے۔ پیش لفظ دراصل

تہ خانہ

پڑھنے والوں کو بہکانے کا خوبصورت طریقہ ہے، اور مجھے چیپ قسم کی پبلسٹی سے ہمیشہ سے بڑی نفرت رہی۔ انسان میں اگر آگے بڑھنے کی دھن ہے تو اُسے چاہیے کہ اپنے ہی بل بوتے پر بڑھے۔ کسی کا کلیں سے بیٹھ کر راستہ طے کرنے کی بجائے میں اس چیز کو کہیں زیادہ پسند کروں گی کہ لڑکھڑاتے قدموں سے خود ہی اپنی منزل کو پہنچوں — !!

واجدہ تبسم
ریلوے بلاک ۱۳۱۔ فلیٹ نمبر ۱
سانتا کروز (ویسٹ) بمبئی ۵۴

تہ خانہ

•

گورے گورے ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہے تھے۔

بڑے سے تھال میں گیہوں کا آٹا بھگوئے ذکیہ بی گُلی لگا رہی تھیں۔ ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ان کا ہلکا پھلکا بدن جھٹکے کھا رہا تھا۔ کھلے گلے کے کرتے میں سے گولائیاں امڈی پڑ رہی تھیں۔ راشد میاں کو شرارت سوجھی، ایک کنکر اُٹھا کر پھینکا جو سیدھا ان کے گلے میں سے ہوتا ہوا کسی نشیب میں جا بیٹھا۔

"اے واہ، ذرا سی لاج بھی نہیں آتی ۔ !"

میاں اشارے سے بولے، "لاج کیسی ۔ ؟"

"ادھر اماں جان بیٹھی ہیں، نظر نہیں آتیں کیا ۔ !" انہوں نے اشارے میں جواب دیا

اب کے راشد میاں زور سے بولے، ہنسی منہ پر بکھری ہوئی :۔

"کیوں جی اگر ہمیں ...."

ابھی ان کی بات منہ میں ہی تھی کہ پچھواڑے کے دروازے سے دھڑ دھڑ کرتے تینوں بچے داخل ہوئے۔ خوشی سے ان کے منہ تمتما رہے تھے۔ منّا دور ہی سے چلّا کر بولا :۔

"اجی اماں جی! ابّا جی! بلّی نے بچے دیئے ہیں ۔" شانو نے آواز میں آواز ملائی۔

"ہاں ابّا ہم نے خود دیکھے ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔"

بے بی بھلا کسی سے پیچھے کیوں رہتی۔ "ہاں ابّا چمک کے جب گھو بی گاؤ بی بک کہیں"

"ہیں !۔۔ راشد میاں بھی بچوں میں بچے بن گئے۔

"ہاں، ہاں" تینوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔

"آپ خود چل کر دیکھیے ابّا۔ اتنے پیارے ہیں۔ ہم نے دور ہی سے دیکھا ہے، ورنہ بلّی تو نوچ ڈالے گی۔

راشد میاں کے چہرے پر بھی بچوں کی سی خوشی کھیل رہی تھی۔

"اچھا اچھا چلتے ہیں بھئی! مگر جو بلّی مار بیٹھے ـــــ ؟" بچوں کو خوش کرنے کے لئے خواہ مخواہ کی بزدلی دکھا رہے تھے۔

"وہ نہیں مارے گی ابّا۔ ہم کوئی چوہے تھوڑا ہی ہیں۔"

"ہم تو ایک والا لیں گے۔ وہ جو پیلا پیلا ہے" عشّانو نے سب سے پہلے قبضہ جمالیا۔

"اور ہم وہ کالے دھبّوں والا" ہاں۔ منّے نے بھی حق جتا دیا۔

"اور پھر ہم کیا لیں گے ؟"

"بلّی جو تمہاری ہے" راشد میاں نے فیصلہ کرنا چاہا۔

"ہش" پھر وہ غصّے سے بولی۔ "اتّی بڑی بلّی ہم نہیں لیتے۔"

آپس میں تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ راشد میاں ہنس کر بولے۔

"ارے بھئی ابھی سے تو نہ لڑو۔ ابھی انہیں ذرا بڑے تو ہو لینے دو۔"

ہنستے بولتے سب کے سب دروازے سے نکل گئے۔

ذکیہ بی کے ہاتھوں میں اب تک آٹا لگا ہوا تھا۔

"ہونہہ! کیسے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کم بخت بلّی کو بھی اسی وقت بچّے جننا رہ گیا تھا۔ اور یہ بھی کیسے ہیں۔ کہ بچوں میں بچے بن جھٹ اٹھ کر چل دیے۔" ذکیہ بی کا جی جل کر رہ گیا۔

ساس نے اُدھر سے بڑبڑی چھوڑی۔ "اے میں کہوں اب روٹی پکے گی یا یوں ہی آٹا ملتی رہو گی۔ روٹی کی بجائے سویاں اتارنے کا تو ارادہ نہیں ہے؟"

ذکیہ بی نے تلملا کر ساس کو دیکھا: "کبھی آپ لوگ بہو کے رہے ہوں تو کہئے نا۔ آپ کو تو وقت پر کھانا مل جائے گا۔"

میاں گودام سے لوٹے تو بچّے آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ بے بی مارے اتراہٹ کے کندھے پر چڑھی بیٹھی تھی اور ہنس ہنس کر باپ کے ساتھ باتیں ہو رہی تھیں:۔

"اور اباجی نے اسے پکارا تو بولی تک نہیں۔ پہلے تو موتی بولتے ہی بھاگی آتی تھی۔"

"اور ہاں ابّا،" شانو بولا، "آپ کے [illegible] بھی گیا مگر وہ تو ویسی ہی بیٹھی رہی، جیسے نہ جانے کون بلاتا ہو۔ کتنی بری ہے سالی!"

"ارے ارے! یوں گالیاں نہیں دیا کرتے ننّھے بچّے۔"

باپ نے پچکار کر کہا۔

"تو پھر آئی کیوں نہیں؟"

"بھئی اب وہ ماں بن گئی ہے نا۔ اب اسے ہم سے زیادہ اپنے بچوں کا خیال ہوگا۔ اب وہ کیا ہماری بات سُنے گی بھلا۔؟"

میاں نے تو بچوں سے سرِ راہ یہ بات کہہ دی، مگر یہ تیر سیدھا ذکیہ بی کے دل میں جا کر اٹک گیا۔ پار نکل جاتا تو اتنی کلپ نہ ہوتی، مگر وہ تو وہیں چبھا رہ گیا۔ دھوئیں کے بہانے انھوں نے آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو پونچھا تو ساس نے دیکھ لیا۔

"دلہن اپنی گود تو بھرتی نہیں۔ ہوئے نا اصل بلّی کتّوں کا بھی حسد رہے چھوٹا۔"

بہو نے تڑپ کر ساس کو دیکھا، مگر وہ اپنی کرتی کی تُرپائی کرنے میں مشغول ہو گئیں تھیں۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی سب کے سب پھر گودام کی طرف بھاگے۔ اور تو اور اب کے ساتھ میاں نے ذکیہ بی کو بھی گھسیٹ لیا۔

"ذرا دیکھنا تو کتنے پیارے بلونگڑے ہیں۔"

ادھر سے اماں چلائیں: "دولہن کیا کام کے ہوئے! اُٹھا پھینکو۔"

"ارے واہ! اماں بی یہ خوب سُنائی آپ نے۔" وہ ہنسنے لگے، "بھلا اتنے اتنے ذرا ذرا سے، بلونگڑے مر نہ جائیں گے؟"

"اے! تو کیا گلے میں باندھ کر لٹکاؤ گے؟ ابھی چار دن کو بڑے ہوں گے تو جگہ جگہ گو موت

کرتے پھریں گے۔ خواہ مخواہ گندگی ہوگی۔"

مناجٹ بول اٹھا: "واہ بلی گندگی کہاں کرتی ہے! بے چاری پہلے تو گڑھا کھودتی ہے اور پھر اس میں۔۔۔۔۔"

دادی نے پوتے کی بات کاٹ دی: "اے بیٹا! تو پھر بستروں میں سلاؤ، جلدا کیا جا رہا؟"

"یہ اماں کو بس سدا یوں ہی کھٹی پھرتی ہیں، چلو ذکا۔" بچے تو بچے تھے، میاں بونگڑوں کو دیکھ کر یوں اچھل رہے تھے، جیسے سب سے چھوٹے بچے یہی ہوں۔

بونگڑے چپ چپ دودھ پی رہے تھے۔ بند آنکھوں سے ٹٹول ٹٹول کر ماں کی گرم گود میں گھسے جا رہے تھے۔ بلی یوں مطمئن تھی جیسے اب دنیا کی کسی چیز کی حسرت باقی نہ رہ گئی ہو۔

"ارے بلی کے لئے دودھ لائیں ہم؟ بھوکی ہوگی۔" اور کسی کے جواب کا انتظار کئے بغیر منا اندر دوڑ گیا۔ طشتری میں دودھ لے آیا اور بلی کے سامنے آہستگی سے رکھ کر بولا:

"لے پوسی پوسی پوسی، لے پی لے۔"

بلی نے نخاہ سن کر ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں اور دوسرے ہی لمحے پھر بند کرلیں۔

شاید گرم چائے پر دل جا رہا ہوگا اس کا۔" اب کے ننانو میاں دوڑ گئے چینی کی طشتری میں چائے لاکر اس کے سامنے رکھی اور بڑے پیار سے پچکار کر بولے:۔

"لے موتی، یہ چائے پی لے۔"

موتی نے پھر آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں۔

"ہش۔ وہ تو پراٹھا کھائے گی۔" بے بی اندر دوڑ گئی اور مٹھی میں نرم نرم پراٹھا دبائے بھاگی آئی اور بالکل اس کی ناک میں پراٹھا گھسیڑ دیا۔

پوسی نے حد درجہ ناگواری سے بے بی کو دیکھا۔ (کوئی طریقہ ہے کھلانے کا۔؟)

بچوں پر ذرا مایوسی چھا گئی۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں کھاتی جی ابا۔"

ابا نے ہنستے ہوئے جواب دیا:۔ "وہ ماں بن کر ہر چیز سے بے نیاز ہو گئی ہے بیٹے۔ اولاد کی محبت ہی ایسی ہوتی ہے۔" بلی نے آنکھ کھول کر سب کو دیکھا، اپنی جگہ سے ذرا ہل کر بچوں کو اپنے نیچے کر لیا۔ پہلے بونگڑے کی ذرا سی کرن نظر آرہی تھی، پوسی بڑی محبت سے اس کی

مگر گرا اپنی زبان سے چاٹنے لگی۔ بچے بددل ہو گئے۔ پھر سے وہی سوال دہرانے لگے:-

"یہ کچھ کھاتی کیوں نہیں ابا؟"

"بھوک نہ لگی ہوگی"۔ راشد میاں کو خود کوئی معقول جواب نہ سوجھ رہا تھا۔

"ارے واہ! بھوک کیسے نہ لگی ہوگی؟ روز تو جب پوس پوس کرکے بلاتے تو بھاگی چلی آتی تھی۔ آج کیا ہوگیا، روز تو جب تب دسترخوان پر دھتکاری جاتی تھی اور آج تو کھانے کو سونگھتی بھی نہیں۔"

"ارے اسے گوشت کھلانا چاہیے" منا پھر دوڑا اور ہاتھ میں کچے گوشت کا ایک بڑا سا پارچہ اُٹھائے آیا۔

"اب تو کھائے گی سالی!" اس نے جوش میں آکر کہا۔

"پھر وہی گالی!" راشد میاں کبھی تربیت سے غافل نہ رہتے، مگر منے نے اپنی گرم جوشی میں ان کی تربیت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اور عین بلی کی بند آنکھوں کے سامنے لوتھڑا یوں لٹکایا کہ ناک سے چھونے لگا۔

بلی نے ہلکی سی کسمساہٹ کی، اپنی جگہ سے اُٹھی اور دوسری کروٹ پر بیٹھ گئی۔ دونوں بلونگڑے دوسری طرف سے دودھ ڈھونڈنے لگے۔

"آج تو وہ کچھ نہ کھائے گی" راشد میاں ہنس کر بولے:-

"اب اسے بچوں کے سامنے کوئی چیز نہیں بھاتی"

ذکیہ بی کو اپنا دل پہلو میں کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو انہوں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے گودام سے نکل گئیں۔

گھر کی ہنستی بولتی فضا میں جیسے رکاوٹ آگئی، مگر صرف ذکیہ بی کی حد تک۔ دل اندر ہی اندر جیسے کٹا جاتا اور گھر میں تو جیسے دیکھو تب پوسی اور بلونگڑے موضوع بنے ہوئے ہیں۔ میاں باہر سے آتے تو بچے ہاتھ پکڑ کر سیدھے گودام میں دوڑ جاتے۔ بچے اسکول سے لوٹتے تو بستے بغل میں لٹکے ہی ہوتے اور بلی کا طواف شروع ہو جاتا۔ ذکیہ بی کے دل میں جیسے گرہ پڑ گئی۔

"بچہ بھی دنیا میں کیا نعمت ہے۔ چاہے انسان کا ہو۔ جانور کا ہو، سب ایک گھیرے۔

رہتے ہیں ۔" اپنی خالی کوکھ کا خیال آتا تو اللہ میاں پر غصہ آنے لگتا۔

"محلے میں جس کو دیکھو کر پر کالا پیلا بچہ چڑھائے پھرتی ہے۔ گھر بھرے پڑے ہیں اور کمانے کو دانا دُنکا تک نہیں۔ خود میاں کو تین تین ہیں۔ میری بھی گود بھر دیتا تو کیا جاتا خدا کا؟"

راشد میاں بڑے دل والے، بڑی ہمت والے میاں تھے۔ ذکیہ بی کی خالی گود پر انہیں کبھی اعتراض نہ ہوا۔ ہوتا کیوں! اللہ نے انہیں تو آل اولاد سے خوش ہی خوش رکھا تھا۔ سوتن آنگن کو تین تین بچوں کی چیخ و پکار خاصا آباد کر دیتی ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ عورت ہونے کے ناطے خود بی ذکیہ ہی ایک ننھے منے وجود کے لئے ترستی تھیں۔ شادی کو چھ سات سال تو ہو ہی چکے تھے کیسے کیسے ارمان جی کو لگے ہوئے تھے۔ مگر انہیں دیکھ کر تو بجائے پیار کے ان کے آگ لگی تھی۔ اپنے ہوتے تو کلیجے سے لگائے لگائے پھرتیں۔ مگر اب تو ان کی ہنسی، ان کی چیخ پکار جیسے کانوں میں سیسہ ڈالتی۔ بات بے بات دھتکارا کرتیں۔ خواہ مخواہ ڈانٹ ڈپٹ کرتیں۔ غصے کی بات پر بھی غصہ اور پیار کی بات پر بھی غصہ۔

پہلے پہل شادی ہوئی تو بچے چھوٹے تھے، سمجھے کہ ہماری ہی ماں ہوگی۔ مگر پہلی ماں ایسی تھی کہ بھول سے بھی پھٹکار نہ کرتی۔ غصے کی حرکت پر بھی پیار کرتی اور پیار کی حرکت پر بھی پیار ہی کئے جاتی۔ بھول سے کبھی پھول کی چھڑی بھی چھو گئی۔ ایڑیاں گھس گھس کر ضد کی پوری کردی۔ وہی اماں اب کیسی ہو گئی تھی کہ دیکھتے ہی آنکھوں میں خون اتار لیتی۔ کہاں تو وہ پیار دُلار اور کہاں یہ روز روز کی ہیٹ پھٹکار۔ بچے ہی تو تھے، تھوڑے ہی دنوں میں یہ حال ہو گیا کہ ماں سے کٹے کٹے رہنے لگے۔ دن بھر میں دو چار باتیں کرلیتے تو کر لیتے، ورنہ تینوں آپ ہی آپ روٹھتے بھی منتے بھی۔ بہت ہوا تو شام کو باپ کے سامنے شکایت کر دی۔ نہیں تو دادی کی جان پر ستم توڑنے لگے۔

ساس بہوؤں کی آپس میں کبھی نہیں بنتی۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اب یہاں دیکھو تو پوتے بھی تھے اور پوتی بھی، اب کون ارمان بھلا ان کے جی کو لگا رہ گیا تھا۔ مگر گھونگٹ بھی نہ اٹھا ہوگا کہ ساس نے بات بات پیچھے طعنہ دینا شروع کر دیا۔

نہ کبھی ذکیہ بیگم کے دن چڑھے نہ ساس کی زبان رکی۔ مہینے پیچھے ہر بار ذکیہ بیگم کو آس بندھی کہ ممکن ہے اب کے سے حمل رہ گیا ہو۔ مگر وہ اسی پابندی سے ناغہ کرتی رہیں

اور ساس اسی لگن سے طعنوں کے تیر برساتی رہیں۔ اور اِدھر ہر لمحہ ذکیہ بیگم کی آنکھوں میں منا، شانو اور بے بی کھٹکنے لگے۔

کہنے والوں نے جھوٹ نہیں کہا ہے کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ایک بار یونہی ذکیہ بی کے متلی اُٹھی، تے ہوئی اور چکر پہ چکر آنے لگے۔ ہاتھوں پیروں کا دم ہی جیسے جاتا رہے پلنگڑی سے لگ گئیں۔ متلی چکر میں دنوں کا حساب بھی بھول گئیں اور مہینہ چڑھ گیا۔ دوسرے مہینے پلنگ چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ کام کاج میں چلنے پھرنے لگیں، تو ساس نے دیدے گھما گھما کر دیکھنا شروع کیا۔ متلی چکر تو ٹھہری۔ چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا اور چال میں یہ بھکا بھکا پن! اور دن گزرے جا رہے ہیں اور بہو ہیں کہ پابندی سے نماز پڑھے جاتی ہیں۔

ساس کو بڑا ارمان تھا کہ پانچ پوتوں کی دادی کہلاؤں۔ ذکیہ بی تو اپنے رب سے اتنی مایوس تھیں کہ اس قسم کی خوش نصیبی کا خود پہ گمان ہو ہی نہ سکتا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ دو چار مہینے بعد پیٹ سامنے ہی سامنے بڑھا چلا آنے لگا اور ادھر اچھی بُری چیز کے لئے طبیعت للچانے لگی۔ کبھی کھٹے بیر ہیں تو کبھی تیز تیز مونگ کے بڑے۔ کبھی جواری کی باسی روٹی کے ساتھ اچار پہ طبیعت اُمڈ رہی ہے تو کبھی اودی اودی جامنوں پر۔

ذکیہ بی کو کیسی کیسی شرم آتی کہ میاں بھلا کیا سوچیں گے کہ یہ ایسی آل کماؤنی کیسے ہو گئی ہے کہ ہر چیز پہ مرجھکوں کی طرح ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ مگر ایک دن محلے کی دائی نے جو یونہی اماں جان سے گپ لڑانے چلی آئی تھی، یہ انکشاف کر کے کہ بہو بیگم کو تو پانچواں بھر رہا ہے۔ ذکیہ بی کے دل کے آنگن میں سو سو گلاب کھلا دیئے۔ آنکھوں کی پتلیوں میں چاند چمکنے لگے۔ دل کے کسی کونے سے آپ آپ صدا آنے لگی۔

"سو جا رے میرے پیارے سو جا رے میرے بالے"

ذکیہ بی ان دنوں زمین پر نہیں آسمانوں پہ چلتی تھیں اور ہواؤں میں اڑتی تھیں ساری تیزی تندی، ساری بدمزاجی ہوا ہو گئی۔ وہی ساس کہ جن سے لڑتے جھگڑتے اِدھر کا سورج اُدھر ڈھل جاتا اب ایسی پیاری ہو گئیں کہ اماں جان ہیں تو سب کچھ ہے۔

"اماں جان کے دانتوں میں زور ہی کہاں ہے کہ بیچاری کچھ سخت گرم چبا سکیں۔"

کبھی ستریاں پک رہی ہیں تو کبھی زرم زرم گلتی، کبھی چاولوں کے آٹے کا حلوہ ہے تو کبھی بادام کا حریرہ۔ بچوں سے بھی آپی آپ ملتی ہو گئی۔ جو چیز آ رہی ہے سب لِ بانٹ کر کھا رہے ہیں۔ بچے بچے ہی ٹھہرے، لگا! میں زری دیکھی تو ادھر ہی ٹلک پڑے۔ بچے ماں کے آس پاس منڈلا رہے ہیں۔ میاں سے تو تو میں میں کی بجائے پیار دُلار کی باتیں ہو رہی ہیں۔ چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے۔ میاں تو بیچارے سدا ہی کے سیدھے سادے تھے۔ یہ آپی اینٹھ جاتی تھیں۔ اب گھر پر خوشیوں کا دور دورہ تھا، کونے کونے سے مسرت ٹپکی پڑتی تھی۔

چلّہ نہا کر اُٹھیں تو پھر گھر کے کام کاج گلے پڑ گئے۔ مگر اس میں بھی ایک لطف تھا۔ اِدھر اُدھر سے آ کر بچے کا منہ چوم جاتیں، گود میں اُٹھا لیتیں۔ سینے سے لگا لیتیں، پیشاب کر دیا ہوتا تو پوتڑا بدل دیتیں۔ روئے نہ روئے آپی آپ بہلاتیں، مناتیں۔ اور جو کبھی رو ہی دے تو کس کی ہانڈی، کہاں کی روٹی ہانڈی جلتی ہے تو سو بار جلتی رہے روٹی کوئلہ بنتی ہے تو ہزار بار بنتی رہے، جیسے ایسا لال! لاکھوں روپے وار پھینکوں۔

ملنے والیاں خواہ مخواہ ہی اتراتی پھرتی تھیں کہ دودھ نہیں اُترتا، بچے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ میوے کھا رہی ہیں۔ پھل چوس رہی ہیں، حریرے ڈھکوس رہی ہیں اور پھر بھی شکایت کہ دودھ سوکھتا جا رہا ہے۔ یہاں تو بی ذکیہ نے کبھی میوہ چکھا نہ پھل کی خوشبو ہی سونگھی۔ یہ تک نہ جانا کہ حریرہ کیا بلا ہے۔

بچہ پلانے کو بیٹھتیں تو لگتا کہ بس دو نہریں ہیں کہ اُمڈی چلی آ رہی ہیں۔ کیسا بہتوانی دودھ تھا کہ دن بھر میں بچے کو چار چھ بار پیٹ بھر بھر پلانے کے بعد بھی تین چار کرتے بدلنے پڑتے۔ جب تک گود میں لیتیں محبت کی ایسی لہریں اُٹھتیں کہ بنا کھلائے پیے ہی دھاریں بہہ نکلتیں۔ بچے کو پا کر ہر چیز سے بے نیاز ہو گئیں۔ ساس کہہ کہہ کر مر جاتیں مگر حلق سے نوالہ نہ اُترتا۔

اچھا بُرا تو اوپر والا ہی کرتا ہے۔ کون جانے کس بات میں اُس کی کیا مصلحت چھپی ہے۔ ہم لاچار بندے تو بس یہی کہہ کر دل کو تسلی دے سکتے ہیں کہ اللہ کا جو کام ہوتا ہے، مصلحت سے ہی ہوتا ہے۔

گرمی کے دن تھے، بدن تھے کہ جھلسے جا رہے تھے۔ اُترتی دھوپوں میں بچے کو ٹھنڈے پانی سے نہلایا۔ گرمی کے دانوں کے مارے جسم بھر بھرا گیا تھا۔ موٹا تازہ۔ گدگدا بچہ پانی کے ٹب میں بیٹھا تو لگا چھپ کرنے کے چھپاکے اُڑانے۔

بچے کو خوش دیکھ کر ماں کا جی کیسا خوش ہوتا ہے! ذکیہ کے دل میں کوئی جھانک کے دیکھتا، گلزار کھلے جا رہے تھے۔

"دولی دُلہن غضب خدا کا! ایسی چلکتی دھوپ میں کھلے آنگن میں بچے کو نہلائے جاتی ہو اور اتنی دیر سے پانی میں بٹھال رکھا ہے۔ دھوپ لگ جائے گی نا؟"

"اماں جان گرمی تو دیکھئے نا۔ جھلسا جا رہا تھا۔ اب کیسا خوش ہو رہا ہے"

"خاک خوش ہو رہا ہے۔ نمونیہ ہو جائے گا، ہاں!"

ذکیہ بی کو ہنسی آگئی:۔ "نمونیہ؟ اوئی اماں جان! بھلا دھوپوں کے دنوں میں نمونیہ ہوگا؟"

"تم کو بھلا کیا تجربہ ہے بی بی؟ تمہاری بڑی نند کی بچی یوں ہی جاتی رہی، اچھی خاصی، کھیلتی مالتی۔ بس نہلانا ہی بہانہ ہو گیا۔ مگر تم لوگ کسی کی مانو بھی۔ اگلے زمانے والوں کو تو تم نے لوگ یوں ہی چٹکیوں میں اُڑاتے ہو"

ذکیہ بی نے ہنستے ہنستے سفید تولیے میں لپیٹ بچے کو اُٹھا لیا۔ اور راشد میاں نے روتے روتے سفید ململ میں لپیٹ قبر میں سُلا دیا۔

دو ہی چار دنوں میں ذکیہ بیگم کا کیا حال ہو گیا: ذرا سا منہ نکل آیا۔ ہاتھ پاؤں سوکھ گئے، دل رہ رہ کے بس ہو ہو کے جاتا۔ اپنے دیدوں دیکھتے، اپنے ہاتھوں بچہ کو نہلایا تھا، سفید ململ میں لپیٹ کر موگرے کے ڈھیر میں چھپا دیا تھا۔ مگر مامتا کا مارا، بے کل جی چین پائے تو کیسے؟ کونے کھدروں میں جھانکتی پھرتیں۔ کبھی چولہے کے پاس دیکھتیں تو کبھی دالان میں۔ یہاں تو نہیں چھپ گیا؟ وہاں تو نہیں چھپ گیا؟ اماں جان آپ نے تو نہیں دیکھا؟ یہیں تو سویا تھا! ابھی کے ابھی میں کہیں چلا گیا؟ کہاں کھو گیا۔

روتے روتے آنکھوں میں گلابی گلابی دھبے تیر گئے۔ بڑبڑاتے پکارتے ہونٹ

پڑ گئے۔ مگر بہو کو آنا تھا نہ آیا۔ عمر بھر کے لئے کلیجے کو پھانس لگا کر چلتا بنا۔ بہو بھول تھا ذکیہ بی چمن۔ بھول گیا تو کیا چمن اور کیا چمن میں بہار! وہی دن تھے اور وہی راتیں۔ بات بات پر الجھ پڑتیں۔ پاگلوں جیسی حرکتیں کرتیں۔ کاٹنے کو دوڑتیں۔ بعد میں پھر کبھی تو گود ہری نہ ہوئی۔ ان کی قسمت میں اوپر والے نے ایک ہی پھل رکھا تھا۔ وہ بھی ادھ پکا۔

باپ کو دیکھتے ہی بچے آگے پیچھے جھول گئے:۔

" ابا! ابا! بلونگڑوں نے آنکھیں کھول دی ہیں۔"

" اچھا؟ " وہ ذرا بناوٹی حیرت سے بولے۔

" ہاں ابا! اور اب تو وہ ذرا ذرا دور تک گھوم پھر بھی لیتے ہیں۔"

بلی کا ٹھکانا آج کل ذکیہ بی کے اپنے کمرے میں تھا۔ سات گھر گھمانے کے بعد اس نے چھپر کھٹ نیچے ہی اپنی ٹیک لگائی۔ ذکیہ بی کے چھپر کھٹ کے پاس راشد میاں کا بڑا سا پلنگ تھا۔ بچے باپ کے پلنگ پر چڑھ گئے اور سر نیچے جھکا جھکا کر رینگتے ہوئے بلونگڑوں کو دیکھنے لگے۔

راشد میاں نے بھی سر جھکا کر دیکھا:۔ پوسی بڑے اطمینان سے دودھ پلا رہی تھی۔ چھوٹا بلونگڑا اس کی دم کے پاس پڑا پیاؤں پیاؤں کر رہا تھا۔

" ارے اس کالے دھبوں والے کو کس نے ماں کے پاس سے ہٹا دیا؟" راشد میاں ذرا الجھ کر بولے۔

" میں نے "۔ شانو سہم کر بولا۔

" اور جو اس کی ماں اس کو ادھر ادھر ڈھونڈتی پھرے گی!"

" وہ وہیں تو چپکا ہے ابا، ذرا منہ موڑے گی تو آپ دکھ جائے گا۔"

" خبردار! جو بلونگڑوں کو کبھی ماں سے الگ کیا: وہ سارے میں چلاتی پھرے گی۔ ہاں سن لو "۔ راشد میاں کے بگڑے تیور دیکھ کر تینوں بچے سہم گئے۔

ذکیہ بی، جو توے پر روٹی ڈال رہی تھیں۔ روٹی کے ساتھ ساتھ اپنا پنجہ بھی ڈال گئیں۔ "سی" کی آواز ان کے منہ سے نکلی۔ انگلیاں جل کر کورپا ہو گئیں تھیں۔

"خبردار! جو بلونگڑوں کو ماں سے الگ کیا۔" ان کے کانوں میں بس یہی گونج باقی رہ گئی، "خبردار! خبردار! خبردار!"

رات کے کھانے پر آلو کا سالن تھا۔ جو میاں کا من بھاتا کھاجا تھا۔ مسور کی دال، چپاتیاں اور کھیر۔ آلو کے سالن میں غلطی سے مرچیاں زیادہ پڑ گئیں تھیں۔ سو سو کرکے کھائے جا رہے تھے۔ بی بی نے کھیر کا پیالہ سامنے بڑھایا:۔

"ایسا بھی کیا بس کھائے جا رہے ہیں۔ ہٹائیے رکابی سامنے سے۔ ذرا سی کھیر تو لیجیے، ٹھنڈک پڑ جائے گی۔"

"اہا کھیر!" راشد میاں خوشی سے بولے۔ میٹھوں میں کھیر پر دم دیتے تھے۔ پیالہ پکڑ جلدی جلدی چمچے چلانے لگے۔ زبان میں اس بری طرح جلن ہو رہی تھی کہ میٹھے سے بھی آگ بجھی نہیں۔ ابھی سُو سُو جاری ہی تھی کہ پیالہ پکڑ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" ذکیہ بی حیرت سے بولیں۔

ہنس کر بولے، "ذرا پوسی کو کھلا دیں تھوڑی سی۔"

ذکیہ بی ذرا برا مان کر بولیں، "خود آپ کے منہ کی آگ تو بجھی نہیں اور بلی کا چونچلا سوجھ رہا ہے۔ کھا لیجیے نا۔ آپ کا تو پسندیدہ میٹھا ہے۔"

"بلی بھی تو پسند کی ہے۔ ایسا بھی کیا ہے۔ بیچاری نے دو دو بچے جنے ہیں، کچھ تو مال اسے بھی تو ملے۔"

باپ کے ساتھ بچے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ "ہاں ابا! ہم کھلائیں گے، ہم بھی کھلائیں گے۔"

ذکیہ بی نے سامنے سے رکابی سرکا دی۔ "حلق سے اترے تب نا!"

لگتا تھا سارے گھر والوں کے دلوں پر بلی چھا کر رہ گئی ہے۔ اماں جان نے ریشمی کترنوں سے بلونگڑوں کے لئے گلوں میں ڈالنے کو پٹے سیئے۔ جن پر دو دو پیسوں میں ملنے والے چھنکنے گھنگھرو بھی ٹانک دیے۔ سردیوں کے دن تھے، اس لئے راشد میاں نے ماں سے سفارش کی کہ بلی کے لئے چھوٹا موٹا۔ پرانے دھرانے کپڑوں کا تھالچہ سی دیا جائے۔ پوسی سردی سے مر نہ جائے گی؟

بلی خالہ کے کیا ٹھاٹ تھے: مزے سے گدے پر لیٹی ہیں۔ ادھر پیلا بلونگڑا ادھر کالا بلونگڑا۔ گھر میں دو گھڑی کو پڑوسیوں کے گھر کی خیر خبر لے کر، گھوم گھام کر آتی ہیں، پھر پہلو میں بلونگڑے ہیں اور ان کی زبان۔ پتلی سی زبان سے اتنا چاٹتیں کر بلونگڑے موئے گیلے گیلے ہو جاتے۔

باپ کی اجازت سے بچے بلونگڑوں کو اٹھا کر دالان میں لے آتے اور گھر بھر کو تماشہ ہو جاتا۔ شانو اپنا گیند پھینک دیتا اور بلونگڑے اس کے پیچھے لپک پڑتے بستر بچھائے جاتے تو بلونگڑوں کو نئی شرارت سوجھ جاتی۔ چاروں، گدوں پر لوٹنے پڑتے۔ دو چار کھروچے جب تک بچوں کے ہاتھوں پر نہ پڑ جاتے نہ یہ مانتے نہ وہ مانتے میاں ہنس کر بتاتے:۔

"دیکھا ذکا؟ بدمعاشوں نے میرے ہاتھ بھی لہولہان کر ڈالے۔"

ان کے لہجے میں پیار ہی پیار بھرا ہوتا۔

"سب بلی اور اس کے بچوں کے دیوانے ہیں۔ کسی کو فرصت نہیں کہ دو گھڑی کو میرا بھی حال پوچھ لے" ذکیہ بی نے بڑے کرب سے سوچا۔

سردیوں کی راتیں تھیں، چٹاخے کی سردی پڑ رہی تھی۔ محراب میں ننھی لوسے قندیل جل رہی تھی۔ سب رضائیوں میں سکڑے سمٹے پڑے تھے۔ بڑے سے پلنگ پر تینوں بچے آڑے آڑے سوئے تھے اور خود چھپر کھٹ پر راشد میاں کے پہلو میں ذکیہ بی۔

ذکیہ بی نے منہ پر سے رضائی سرکائی اور بے چین نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا، سبھی سو رہے تھے۔ رضائی کو دھیرے دھیرے کمر تک، اور پھر پیروں تک سرکا دیا۔ ہولے سے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میاں نے جو پلنگ ہلتا محسوس کیا تو نیند کی ماری آنکھوں سے بیوی کو دیکھ کر بولے:۔

"کیا کر رہی ہو؟"

"ایسے ہی پیاس لگی ہے۔"

میاں پھر کروٹ لے کر سو رہے۔

ذکیہ بی چھپر کھٹ سے اتر کر کھڑی ہو گئیں میاں کے منہ پر جھک کر اطمینان کر

لیا کہیں کچی نیند تو نہیں ہے۔

تھوڑی دیر یوں ہی کھڑی رہیں۔ میاں خر خر کر رہے تھے۔

ذکری بی نے اطمینان کی سانس لی۔ نیچے بیٹھ کر پھر کھٹ کے نیچے جھانکا۔ بلی کہیں سیر کو گئی تھی۔ دونوں بلونگڑے گادی پر خر خر کرتے پڑے تھے۔ ذکری بیگم کی سانس اوپر نیچے ہونے لگی۔ دل کو دبا کر انھوں نے گدی کا کونہ پکڑ کر ہولے سے اپنی طرف کھینچا۔

"پیاؤں پیاؤں" دھکا کھا کر دونوں نے ہری ہری آواز میں چلانا شروع کر دیا۔ مدھم سی روشنی میں دونوں بلونگڑے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ دھکے سے ان کی نیند میں خلل آ گیا تھا اس لئے بیچ ہی آنکھیں کھول کر انھوں نے ناگواری سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

ذکری بی نے گدی اس انداز سے لپیٹی کہ دونوں بلونگڑے اس میں اچھی طرح لپٹ جائیں پھر تہ کی ہوئی گدی کو لے کر دھیرے دھیرے آگے بڑھتی۔ پیچھے دیکھتی وہ آنگن میں نکل آئیں۔ کمرے میں نیم گرم سی فضا سے نکل کر باہر اک دم شدید سردی میں اکڑی ہوئیں۔ مگر انھیں سردی کا کوئی احساس نہ ہوا۔

گیارہ بجے کا عمل تھا۔ مرزا صاحب کے گھر سے اب تک باتوں کی اور ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بیگم مرزا کا بڑا اصرار تھا کہ تمہاری بلی کے بلونگڑے ہوں تو ہمیں دینا۔ یوں تھی تو ویسی بلی، مگر یہ بڑے بڑے جھبار دار بال، گدگدے، نرم نرم، موٹے موٹے پنجے، بھاری بھر کم۔ بلونگڑے بھی ویسے ہی ہوں گے۔ محلے بھر میں بہت سوں کے دانت تھے۔

بیگم مرزا اس وقت ذکری بی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔

"اس وقت! خیریت تو ہے؟" وہ بوکھلا کر بولیں

ذکری بی نے بازو کے نیچے سے لپٹی ہوئی گدی نکالتے ہوئے کہا:۔

"کیا کہوں بہن؟ تمہارے کہے کا کس قدر پاس تھا مجھے، روز سوچتی تھی لا کر دوں گی۔ مگر بچے اور ان کے باپ چھوڑیں تب نا! اب سو گئے ہیں تو لے آئی ہوں۔ اور اتفاق سے بڑی بھی کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ مگر بہن! انھیں کہیں اندر ہی چھپا لینا۔ ورنہ تو پھر واپس لے جائیں گے۔"

بیگم نے دیوانوں کے سے انداز سے بلونگڑے چھین لئے۔

"ارے دونوں ہی!" ان کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی

" ہاں مجھے معلوم تھا بن! تمہیں بلیوں سے بڑا پیار ہے اس لیے دونوں ہی کو لے آئی ہوں۔ ایک بلا ہے ایک بلی۔ اب نسل چلاتی رہو" ذکیہ بی نے گھبرائی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا۔

بیگم نے آن جانے میں ایک تیر چلایا:۔

" ان کی ماں تو ناحق ہائے ہائے نہ مچائے گی؟"

بہت دیر تک تو ذکیہ بی کو جواب ہی نہ سوجھا، پھر اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولیں:۔

" بڑے بھی تو خاصے ہو گئے ہیں نا" بڑی مشکل سے وہ ہونٹوں تک ہنسی کو گھسیٹ کر لا سکیں۔

" اے بن! بڑے چھوٹے کو نہ دیکھو، ہوتی آخر اولاد ہی ہے ......"

ذکیہ بی نے ان کی بات پوری ہونے سے قبل ہی کہنا شروع کر دیا تھا: " تو بن رکھو کہاں رہی ہو انہیں؟"

بیگم نے سامنے ہی دالان میں دھرے صندوق کی طرف اشارہ کیا۔ " اس میں ایک گریا بچھوا دوں گی، مزے سے رہیں گے۔ اور اس صندوق میں اتفاق سے ایک بڑا سا سوراخ بھی ہے، ہوا آتی رہے گی۔"

ذکیہ بی جب دسمبر کی کڑکڑا دینے والی سردی میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں تو ان کے ماتھے اور گردن پر پسینے کے بڑے بڑے قطرے جگمگا رہے تھے۔ ڈگمگ قدموں سے چلتی وہ اپنے پلنگ تک آئیں اور میاں کے بازو پر دھماک سے گر پڑیں۔

صبح سارے گھر میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔

بچے الگ بدحواس تھے، اماں جان الگ چنگھاڑ رہی تھیں۔ اور راشد میاں تو ساکت ہی رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت پوسی کی تھی۔ میاؤں میاؤں کر کے سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔

بلونگڑے آخر گئے تو کہاں گئے؟

بس ایک ذکیہ بی تھیں کہ روز کی طرح ہر چیز سے بیگانہ خاگینہ پکاتی بیٹھی تھیں۔

" بے بی سے پوچھئے آپا۔ ایک دن یہ اپنی سہیلی زرینہ سے کہہ رہی تھیں کہ بلونگڑے بڑے ہو جائیں گے تو ایک تم کو دے دیں گے" شانو بولا۔

"واہ وا! اچھے رہے جی تم" منا بے بی کی حمایت میں بولا،

"وہ بے چاری تو خود دانا پیار کرتی تھی، جب نانے کو کر دیا ہوگا؟"

"دیکھیے نا بھائی جان" بی بی نے اپنا ایک حامی پا کر خواہ مخواہ بسورنا شروع کر دیا،

"ہمیں الزام دے رہے ہیں خواہ مخواہ"

"دادی اماں سے پوچھیے۔ وہ ہمیشہ کہتی تھیں کہ بلو کے بچے گندگی دھن ہیں۔ انہوں نے تو کسی کو نہیں دے دیئے؟"

"خاموش رہو بے وقوف" راشد میاں نے منے کو ڈانٹ دیا۔

"بلی نہ کہیں اٹھا لے گئی ہو" راشد میاں تھوڑی دیر چپ رہ کر بولے

"اے واہ! سات گھر تو اس نے پھرا دیئے۔ اب کہاں لے جاتی بھلا، رات میں نے خود چھپر کھٹ نیچے دیکھے"

اور انھوں نے بے اعتباری کے انداز سے بہو کی طرف دیکھا۔

"اور میں کہوں اگر خود ہی اٹھا کر لے جاتی تو یوں کلپ کلپ کر میاؤں میاؤں کیوں کرتی!"

بات تو واقعی دل کو لگتی ہوئی تھی، مگر راشد میاں کی کسی صورت تسلی نہیں ہو پا رہی تھی، پھر شک و شبہ سے بولے۔

"کسی بلے ولے نے نہ کھا لئے ہوں"

"سردی کے مارے دروازے تو سارے بند کر لیتے ہیں، پھر بلا آئے تو کدھر سے!۔ روشن دان بھی کھلے نہیں رہتے"

ہر بات کا واضح جواز موجود تھا۔ پھر!

"میاؤں۔ میاؤں ۔۔ می آؤں"

بلی بری طرح چلا رہی تھی۔ رہ رہ کر چھپر کھٹ کے نیچے جاتی، گودام کی طرف دوڑتی، مودی خانے کے چکر کاٹتی اور پھر جا کر گوری کو منہ سے کھینچنے لگتی جو ذکیہ بی نے جہاں کی تہاں پھینک دی تھی۔

"ذکیہ کا مر پڑے۔ جس نے بھی اس کا کلیجہ کاٹا ہے"

اماں جان نے کلپ کر کوسا دیا۔

ذکیہ بی بیٹھے ہی بیٹھے سر سے پاؤں تک تھرا گئیں۔ بچے الگ رنگ رنگ کی بولی بول رہے تھے۔ راشد میاں ہر بار نئی بات بگھار رہے تھے اور اماں جان کوسنوں کی بھرمار کر رہی تھیں ایک ذکیہ بی کی زبان بند تھی کہ ایک دم ساس نے ان سے پوچھا:۔

"دلہن بیگم، تم نے کہیں دیکھے ہیں بلونگڑے؟"

ذکیہ بی نے اپنی ساری طاقت سمیٹ کر منہ سے آواز نکالی:۔

"میں کسی کے لینے میں نہ دینے میں، میں کیا جانوں؟"

صبح سے اب تک یہ پہلی بات تھی جو ان کے منہ سے نکلی، ورنہ وہ خاموش ہی تھیں۔

بلی نے پورے گھر کے چکر لگا ڈالے مگر بلونگڑے ملنے تھے نہ ملے۔ چار چار چھ چھ منٹ کو باہر سے آتی اور چپر کھٹ کے نیچے گھس جاتی اور ایسی درد بھری آواز سے میاؤں میاؤں کرتی کہ ذکیہ بی کا دل تھرا تھرا اٹھتا۔

"رانڈ دودھ کے مارے دشمن بن گئی ہے۔ جانور ہو یا انسان ہو، میا محبت تو اللہ نے سب کو لگا دی ہے۔" اماں جان، جو سدا بلونگڑوں کو خیرات کر دینے کے بارے میں لیکچر دیتی رہتی تھیں، آج امتا کی پکار کے آگے سپر انداز ہو چکی ہیں۔

بچے اداس اداس اسکول سدھارے۔ راشد میاں منہ لٹکائے آفس چلے گئے۔ اور اماں جان کا دل اس دن سیون میں دلگ سکا۔

لاکھ جانور کے بچے تھے، مگر دن بھر اچھل بھاند جو تھی۔ تاگے کی گنڈی دیکھ پاتے تو اس سے اتنے بچے چلاتے کہ وہ کھل کھلا کر الجھ الجھ جاتی۔ کترنوں کی دھول دھانی کرتے۔ آنی پھینکم بھانک کرتے کہ سارے میں کترنوں اور تاگوں کا جال بچھ جاتا۔ اماں جان بھی منہ لپیٹ کر پڑ رہیں پوس کی پکار نے ان کا کلیجہ ہلا دیا تھا۔

وہ بے چین پوسی پھر آئی۔ پیشانی کے پاس سوکھا ہوا خون جما ہوا، ناک پر مار کے نشان، منہ ایک طرف پھول گیا تھا، ایک پاؤں سے لنگڑاتی ہوئی، اور گدی کے پاس بیٹھ کر مری مری آواز میں میاؤں میاؤں کرنے لگی، یوں جیسے روتی ہو۔

سب اپنی اپنی بول بول چکے تھے۔ بس ذکیہ بی کی دل کی دل میں رہ گئی تھی۔ سب کی باتیں ٹک ٹک سنتی رہیں اور خاموش بیٹھی رہیں۔ اس خاموشی کا اتنا شدید ردعمل ہوا کہ دوپہری

سے انہیں سنتا کر بخار چڑھ آیا۔
ساس نے کانپتا دیکھا تو انہیں اور دالان سے اٹھا کر کمرے میں جا لٹایا اور رضائی اڑھا دی۔ ایک رضائی سے جاڑا نہ گیا تو دوسری بھی لا اڑھائی۔
بچے اسکول سے لوٹے تو گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دادی ہمیشہ کی طرح سیون نہیں کر رہی تھیں۔ اور اماں بھی چولہے کی بجائے پلنگ پر منہ لپیٹے پڑی تھیں۔
شانو بڑی اداسی سے بولا: "بلونگڑے نہیں ہیں تو گھر کیسا لگ رہا ہے بھائی جان!"
منا کچھ نہ بولا۔ دکھ سے سانس لے کر رہ گیا، جیسے جی پر بہت بوجھ ہو۔
"ہائے اللہ! اپن نے تو نام بھی سوچ لئے تھے۔ تارا اور سورج۔ کیوں بھائی جان، وہ پیلے دھبوں والے بلونگڑے کا نام سورج ہی سوچا تھا نا، جو بلا تھا؟"
دکھے دل سے منا بولا: "ہاں بے بی! سورج چلا گیا اور تارا بھی چلی گئی اور اب گھر کیسا اندھیارا اندھیارا سا لگتا ہے۔"
"بڑی عجیب بات ہے کہ چور کا پتہ نہیں چلتا" شانو حیرت اور پریشانی سے بولا۔
بے بی کا ننھا دل محبت اور غصے سے چور چور ہو رہا تھا۔ دانت کچکچا کر بولی:۔
"اگر مل جائے نا تو ٹھاں سے بندوق مار دوں۔"
منا غم سے بولا: "ہم تو پھر ان کے مالک تھے۔ اس کی ماں کا حال تو سوچو ذرا۔ ایک دن کبھی ابا دیر سے گھر پہنچتے ہیں تو دادی اماں کتنی پریشان ہو جاتی ہیں۔"
تینوں خاموش ہو گئے، مگر لگتا تھا کہ ان کے معصوم دلوں سے بلونگڑوں کی یاد کبھی نہ مٹے گی۔
"اماں کچھ پتہ چلا؟" راشد میاں نے گھر میں داخل ہوتے ہی ماں سے پہلا سوال کیا۔
اماں جان نے اٹکل سے تیر چلایا! "جس کے دل کو ماں کی ممتا کا درد ہوئے وہ ڈھونڈھیا کرے۔ ایسا بھی کیا ہوا کوراپن۔"
اماں کا شبہ آپا کر بہو پر جا رہا تھا۔ "موئی نامراد زخموں سے چور چور تھی۔"
"کون چور چور تھا اماں؟" راشد میاں نے حیرت سے پوچھا۔
"اے وہی تمہاری بلی۔ جانے کدھر کدھر کھوجتی پھر رہی ہے کہ سارا منہ بھلا لائی۔ ناک

الگ سوجی ہوئی، پیشانی الگ۔ زخموں زخم۔ خون بھی بہہ رہا تھا۔

"ہوں" یہ ایک بہت لمبی ٹھنڈی سی سانس آپ ہی آپ راشو میاں کے حلق سے نکل پڑی۔
جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ گلی کی مسجد سے مغرب کی نماز کی اذان بلند ہوئی۔
شاذر گوشی میں منے اور بے بی سے بولا:۔

"بھائی جان! او بے بی! چلو مسجد میں چل کر دعا مانگیں کہ اللہ ہماری بی کے بچے......"
دل برداشتہ بے بی بولی:۔ "اللہ میاں ہماری دعا کاہے کو سننے لگے"
"سچ مچ" منا گھبرا کر بولا۔ "ایسا نہیں کہتے، گناہ ہوتا ہے۔"
دھڑ دھڑاتے ہوئے وہ تینوں آگے پیچھے بھاگنے لگے۔

"اے نامرادو! یہ کون کھیلنے کا وقت ہے؟" پیچھے سے دادی اماں چلائیں۔
آنسوؤں میں ستعرق بے بی کی بے بس آواز آئی:۔
"دادی اماں! ہم اللہ میاں سے دعا مانگنے جا رہے ہیں۔"

رات کے نو بجے سردی اپنے زور پر تھی، ادھر ذکیہ بی کا بخار اپنے شباب پر تھا کہ وہ رضائی پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آنکھیں سرخ، ہاتھ پاؤں کانپتے ہوئے، بال الجھے الجھے
میاں نے ہڑبڑا کر پوچھا:۔
"کیا کر رہی ہو۔۔؟"
"ایسے ہی جی گھبرا رہا ہے۔ ذرا باہر جاؤں گی۔"
"مگر اس وقت اتنی سردی میں؟ تمہیں بخار ہو رہا ہے نا؟"
"تو کیا ہوا؟" وہ کانپتی آواز میں بولیں اور جلدی جلدی دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔

دروازے پر اتنی رات گئے انہیں کھڑا دیکھ کر بیگم مرزا حیرت سے بولیں:۔
"تم؟ ارے، یہ کیا حال ہو گیا ہے تمہارا؟ کیا بات ہے بہن؟ خیریت تو ہے؟"
وہ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے بولیں:۔ "بلو بگڑے کہاں ہیں؟"
"ڈربے میں ہیں۔۔۔ کیوں؟" پھر ہنس کر بولیں، "وہ تمہاری بو سی آئی تھی، شاید بچوں کی بو پا گئی کہ بار بار صندوق کے گرد گھیرے ڈالتی تھی، سر پٹختی تھی۔ میں نے بھگا بھگا دیا۔ بہت ستانے لگی تو غفور نے دو ایک پتھر ایسے کس کے مارے کہ منہ الگ سوجا اور ٹانگ

اِلگ لگرا لگی۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔

"اور بلو نگڑے؟" ذکیہ بی نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

" وہ موئے اُداس اُداس سے ہیں۔ دودھ دیا بھی، گر منہ تک نہیں لگا رہے ہیں بڑی بڑی آوازوں سے رو رہے ہیں۔"

ذکیہ بی نے منت بھری آواز سے کہا: "کہاں ہیں وہ؟ ایک نظر دیکھ لوں؟"

"دولہن یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ یہیں تو ہیں۔"

مرزا صاحب کی اماں والان کے کونے میں رضائی میں سکڑی "سوسو، سی سی" کرتی پڑی تھیں، دونوں کو صندوق کے پاس جاتا دیکھ کر بولیں:۔

"بن ماں کے بچوں کی بھی کوئی زندگی ہے موئی! ماں کی گود کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

کئی سال ایک لمحے میں گزر گئے۔ اس ایک لمحے میں کتنی مائیں بنیں، سوتیلی ماں کی ماں بنیں۔ ڈائن، ... بنیں ... ان بنیں، اور پھر اب ان کی گود خالی تھی —!

بیگم نے آہستہ سے ڈھکنا کھولا۔

"میاؤں — میاؤں۔ می آؤ — امی آؤ — امی آؤ۔"

جو جب روتا تھا تو یونہی، امی آؤ، کہتا تھا۔

بخار سے سنسناتا جسم کانپ اُٹھا۔ انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے بلونگڑے کو اُٹھا لیا۔ چونک کر بولیں:۔

"ارے دو ہی دن میں اتنے دُبلے کیسے ہو گئے؟"

دالان کے پرلے کونے سے مرزا صاحب کی اماں کی آواز آئی:۔

"جانوروں کی بات ہے نہ انسانوں کی، سب محبت کا سوال ہے بٹیا۔ ماؤں سے بچے چھینیں یا بچوں سے مائیں......"

ذکیہ بی کچھ نہیں سن رہی تھیں، بلونگڑوں کو اپنی چھاتی سے چمٹا کر بولیں: —

"بس میں ابھی ان کے لئے جا رہی ہوں!"

بیگم مرزا کا مزاج چاٹتا رہا۔ "وہ کیوں بن!"

مرزا سے کچھ کہے بغیر ذکیہ بی جلدی جلدی دروازے کی طرف لپکنے لگیں۔ ان کی خاموشی سے بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔

"اے واہ! خود ہی دیے اور خود ہی لئے بھی جا رہی ہیں ۔۔ کیسی دوغلی زبان ہے بی تہذیبی! کوئی یوں دو منہ کا سانپ پالتا ہے اپنی زبان میں؟"

دروازے سے نکلتے نکلتے، پیچھے مڑے بغیر تیز، گرگراتی ہوئی آواز سے بولیں:۔

"تم نے کبھی بچے جنے ہیں؟"

وہ بے تابی سے گھر میں داخل ہوئیں، بلونگڑے ان کی چھاتی سے چمٹے ہوئے تھے۔

"منے، ساڈو، بے بی۔ دیکھو بیٹو، دیکھو میرے بچو ۔۔ یہ تمہارے کھونے!"

بوکھلا کر وہی چوکس ہو گئی۔ گدی پر سے جھکولاے کر اچھلی اور بلونگڑوں پر ٹوٹ پڑی۔ دیوانہ وار چوم چاٹ کر انھیں کھیلا کرنے لگی۔

تینوں بچے کسی اندرونی احساس سے متاثر ہو کر اک دم جاگ پڑے۔ "اما تارا! ابا جی سورج!" نیند بھری آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر بری طرح چلانے لگے:۔

"اماں جی! ابا جی! یہ کہاں سے آئے؟ کہاں ملے؟ کہاں تھے؟" تینوں کے تینوں بلی اور بلونگڑے پاس پاس ناچ رہے تھے۔

ذکیہ بی کھڑی کانپی جا رہی تھیں، دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام رکھا تھا۔

راشد میاں نے اٹھ کر ان کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔

"میں جانتا ہوں ذکا، دو دن سے تمہارے دل پر کتنا بوجھ تھا۔"

ذکیہ بی نے گھبرا کر میاں کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔

"ہاں۔ جب تم بلونگڑوں کو لے کر جانے لگیں تب میں جاگ رہا تھا۔ مگر میں جان بوجھ کر جیکا بنا پڑا رہا۔ اگر میں تمہارا راز کھول دیتا تو میرے بن ماں کے بچوں کو کبھی ماں نہ ملتی۔"

سہمے سہمے انداز سے ذکیہ بی راشد میاں کو دیکھ رہی تھیں۔

"میں جانتا تھا ذکا تم بہت دنوں یہ ظلم نہ کر سکو گی۔ میرا ایمان ہے ذکیہ کہ ہر عورت کے دل میں ایک تاریک تہ خانہ ضرور ہوتا ہے، مگر وقت پڑنے پر اس تاریکی میں ممتا کی مشعل

ضرور جگمگا اٹھتی ہے!"

"میں ۔ م ۔ م میں ......" جذبات کی شدت کے مارے ذکیہ بی کے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔ جب میں پوسی کی پکار سنی تھی تو مجھے خود اپنی تڑپ اور ممتا یاد آئی تھی۔ جب میں نے سوکھے مارے بلونگڑوں کو روتے دیکھا تو ...... تو ...... میں نے سوچا کہ ماؤں اور بچوں کے لیے ایک دوسرے کے وجود کس قدر ضروری ہیں۔ میرا دل پھٹ جاتا، میں یقیناً مر جاتی اگر میں ......"

راشد میاں نے پیار سے ذکیہ بی کا سر تھپتھپایا۔

"تم جی بھر کر رو لو ذکا۔ آج تمہاری آنکھوں سے جتنے آنسو بہہ جائیں اچھا ہے۔"

"مگر مجھے رونا نہیں آ رہا ہے۔" انھوں نے بے بسی سے کہا اور بچوں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر راشد میاں کے سینے سے لپٹ کر پھپک پھپک کر رونے لگیں۔

••

www.taemeernews.com

ساتواں شہزادہ

خالہ بی یوں تو مرغی کے چوزوں کو دانا چگا رہی تھیں۔ مگر ان کا سارا دھیان دھوبی کی طرف تھا۔

صحن میں ڈھیر سارے کپڑے پھیلے ہوئے تھے اور منجلی بہو بلقیس کپڑے لکھتی بیٹھی تھیں۔ سنجلی بہو کا کام بھی کیا تھا، جدھر نپٹتیں سارا معاملہ چوپٹ۔ یوں کرنے دھرنے کا شوق تو بڑا تھا مگر کوئی کام ڈھنگ سے نہ کر پاتیں۔ پچھلے چکر میں دھوبی کو کپڑے دینے بیٹھیں تو اچکنوں اور قمیضوں کی جیبیں تک نہ دیکھیں۔ ہوتا کیا، اختر میاں کی اچکن کی جیب میں دس دس کے تین نوٹ تھے۔ وہ دھوبی کے گھر چلے گئے۔ دھوبی تھا تو پہچان کا، برسوں سے کپڑے لاتا لے جاتا تھا مگر تیس روپیہ دیکھ کر اس کی نیت بدل گئی۔ صاف، اکر گیا کہ میں نے دیکھے ہی نہیں، دیکھتا تو واپس نہ کر دیتا ــ ؟

خالہ بی کا غصہ بہو پر تھا اور بہو کا غصہ جیٹھ پر۔

" اے واہ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے اُتارتے وقت اپنی جیبوں کی تلاشی لے لیں۔"

" اور تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے دیتے وقت ذرا جیبوں کا جھٹکا ہی لے ڈالیں

مرد تو مرد ہی ٹھہرا، آخر عورتوں کا اور کام ہوتا ہے بی؟ اُلٹے غصہ دکھاتی ہو۔"

تب کی بات ہو بیگم کو یاد تھی۔ ہر کپڑے کو بڑی احتیاط سے جھٹکوا رہی تھیں۔ خالہ بی الگ دیکھ رہی تھیں۔ یک دم بلقیس نے ایک اچکن کی جیب سے ایک پوٹلی برآمد کرلی۔ جلدی جلدی گرہ کھول کر دیکھا۔ دو دو پیسے میں ملنے والی دو گلابی پلاسٹک کی پپنیاں اور ننھے بچے کے منہ میں دینے کا ایک ربر کا نپل!

"اماں دیکھیں یہ کیا ہے؟" اُنھوں نے منہ میں ڈال کر زور سے ساس کے کان کے پاس پپنی بجادی۔ "کیا ہے!" خالہ بی نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کھلونے!"

"تو کیا ہوا ۔۔۔؟" خالہ بی جواری کے دانے آنگن میں پھینکتی ہوئی بولیں، "ڈھیر سے تو بچے ہیں گھر میں، کسی کے بھی ہوں گے۔ رکھ دو وہاں میز پر۔"

"بات تو سمجھی نہیں آپ۔ یہ چھوٹے بھیا کی جیب سے نکلے ہیں ۔۔۔" وہ چھوٹے بھیا پر زور دے کر بولیں۔

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ نکلے ہوں گے چھوٹے ہی کی جیب سے۔ پھر؟"

بلقیس جھلا گئی ۔۔۔ "تو کیا کوئی بات ہی نہیں ہوئی؟"

"جا چھوکری تیری تو عقل ہی پلٹ گئی ہے۔ ارے اتنے سارے بھائی بھتیجے ہیں کسی کے لئے بھی لایا ہوگا۔"

"بھائی بھتیجوں کے لئے لاتے تو دے نہ دیتے، گرہ لگا کر کیوں رکھتے؟ ۔۔۔"

اب کر خالہ بی نے ذرا غور سے بہو کی صورت دیکھی۔ "دلہن تمہارا مطلب میں اب بھی نہیں سمجھی ۔۔۔"

"اب آپ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہیں تو میں کیا کروں۔" وہ اکتا کر پھر کپڑوں پر پل پڑیں۔

خالہ بی کا سارا قصہ اُس رانی جیسا تھا جس کے ایک نہ دو پورے سات بیٹے تھے اور یہ تو ہونا ہی تھا کہ سب سے چھوٹا بیٹا بے حد خوبصورت اور بے حد ذہین ہوتا تھا ۔۔۔ (بہادر ہونا تو خیر لازمی تھا) ملک ملک کی خاک چھانتا اور پھر شہزادی بدر کمال یا پھر شہزادی گل گوہر کو کھوج نکالتا۔ بڑی دھوم دھام سے راجد ھانی کو لوٹتا تو ساتھ میں اپنے باپ کی چھنی ہوئی سلطنت

بھی دوبارہ حاصل کرتا آتا۔ بس چھوٹے میاں کا بھی حسن و من وہی حشر تھا۔ سب میں چھوٹے تھے، سب میں خوبصورت اور کہانی کے شہزادے کی طرح ماں باپ کے لاڈلے بھی۔ اوپر کے چھ بیٹوں کی تو شادی ہو گئی، مگر چھوٹے میاں ابھی کنوارے ہی تھے۔ عمر بھی بہت کہاں تھی، بس یہی کوئی چوبیس پچیس کے اندازے میں تھے۔

وضعدار گھرانوں میں ہوتا ہے کہ ماں باپ جہاں بات لگا دیں، بیٹے بغیر کسی پس و پیش کے سر جھکا دیتے ہیں۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ ماں باپ پیٹ کی اولاد کا بُرا کیوں چاہیں گے؛ ان کی بات نہ ماننے کو کوئی تو حوالہ ہو۔ خالہ بی کی ساری بہوئیں اپنے ہی خاندان کی تھیں۔ کوئی ماموں کی بیٹی کی نند، کوئی خالہ زاد بہن کی بیٹی، کوئی بھتیجی تو کوئی بھانجی۔ خالہ بی کا گھر بھرا پُرا تھا، چھوٹے میاں کی شادی کی ابھی ضرورت ہی کیا تھی؟ ۔ مگر وہ جو ہر ماں کی خواہش ہوتی کہ "بس بیٹے کا سہرا دیکھ لوں"، وہی خواہش یہاں بھی اُبھری۔ بیٹی تو دیکھی بھالی ہی تھی۔ بڑی بہو کی چھوٹی بہن، خالہ کی آنکھوں میں اب تب سے نہیں اس وقت سے چڑھی ہوئی تھی جب بڑے بیٹے کی آرسی مصحف کے وقت لال لال اطلس کا جھم جھماتا جوڑا پہنے ایک چھوٹی سی لڑکی صندل کی کٹوری لئے اور آتے ہی اڑھنگے پن سے بولی۔۔

"بھیّا! ہم آپ کے صندل لگائیں گے تو نیگ دیں گے نا آپ؟"

اتنی پیاری صورت، ایسی بھولی ادائیں کہ سارے لوگوں کی نگاہیں جیسے اس پر جم گئیں اور تو جانے کتنوں نے کیا کیا سوچا ہوگا۔ مگر ادھر خالہ بی نے تو بس تہیہ ہی کر لیا کہ سیانی ہوتے ہی اُسے بھی اپنے گھر کا اُجالا بناؤں گی۔ مگر بات اپنے دل ہی میں رکھی۔

بڑے گھروں کے کھاتے پیتے بچّے جلد ہی جوان ہو جاتے ہیں اور پھر لڑکیاں تو یوں ہی شرط باندھ کر بڑھتی ہیں۔ کوئی سال بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ بڑی دلہن کے میکے سے بلاوا آیا۔ بھائی لینے کو آئے۔ اب بہن بڑی حیرت زدہ کہ ہائے اللہ کوئی کارِ نکاح، تقریب، نہ جلسہ، یہ بیٹھے بٹھائے بلاوا کاہے کو آیا؟ بھائی سے پوچھا تو یہ بھی بس اتنا ہی بولے۔۔

"مجھے تو معلوم نہیں۔ اماں نے کہا جا کر لے آؤ۔ بس میں چلا آیا۔"

دلہن تو کچھ نہ سمجھیں، مگر خالہ بی ہنسنے لگیں۔

"اے دلہن تم بھی بس بوری وہ ہو۔ اتنی بات نہیں سمجھتیں۔ لڑکی ذات کا معاملہ ہے اب کیا سمدھن پورے خاندان میں رقعے بانٹ بانٹ کر دوپٹہ اڑھائیں گی بٹیا کو؟ چلی کیوں نہیں جاتیں۔"

بات وہی نکلی جو خالہ بی نے سمجھی تھی، ماں باپ تو فکر مند ہوئے ہوں گے کہ چھاتی پر بوجھ پڑا۔ مگر خالہ بی کے ایک دل کے ہزار دل ہو گئے کہ چلو اب ہو اپنی ہوئی۔

ادھر بچے بعد دیگرے سب بھائی دلہے بن گئے تھے اور بیچ کے دو بھائیوں کے سہرے بھی ساتھ ساتھ بندھے، نکاح خوانی بھی ساتھ ساتھ ہوئی اور اپنی اپنی دلہنوں کو گود میں اٹھا ساتھ ہی ساتھ پالکی میں بٹھایا۔ اب رہے کون؟ وہی چھوٹے میاں! اب چھوٹے میاں تو لاڈ دلار کے تھے ہی۔ پہلے اور آخری کاج پر تو یوں ہی زیادہ دھوم دھڑکا ہوتا ہے، اور چونکہ چھوٹے میاں اپنے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھ لکھ بھی گئے تھے، اس لئے بھی ان کے وقت زیادہ ہنگامہ ہونا ٹھہرا۔

خالہ بی کو کیا اپنے بیٹوں سے ایسی امید ہو سکتی تھی کہ ان کے ہاں کرتے وہ ناکریں؟ پوچھتیں گچھتیں بھی کیوں؟ رمضان کی عید کے بعد پیغام بھیج دیا۔ غیر خاندان کے ہوں، چال چلن میں کھوٹ چوٹ کا ڈبکا ہو تو جواب میں دیر ہوتی ہے۔ چھان بین کرتے کرتے ہی دن نکل جاتے ہیں۔ یہاں تو اپنے ہی گھر کی سی بات تھی۔ بقرعید کے بعد جواب بھی مل گیا اور چھوٹے میاں کو پتہ چلا تو کب چلا جب خالہ بی نے منگنی کے پھول پہنانے انھیں مسند پر آ بیٹھنے کو کہا۔

"مگر کس تقریب میں؟" انہوں نے ہنس کر کہا۔

"اے چل باتیں بناتا ہے۔ اب اتنا بھی پتہ نہ چلا ہو گا کہ یوں اترا کر پوچھ رہا ہے۔"

جیسوں بھابیاں ہنستی کھڑی تھیں۔ سنجھلی بھابی بلقیس ہنس کر بولیں،۔ "اس لئے کہ اب چھوٹے شہزادے کی باری ہے۔"

سب ہنسنے لگے گر چھوٹے میاں پھر بھی نہ سمجھ سکے۔

"مگر کاہے کی باری بھئی؟"

"اجی جناب اب آپ کے دولہا بننے کی باری ہے۔"

ادھر قہقہے اُٹھے اور اُدھر ان کا جی ڈوب گیا۔

"مگر — مگر مجھ سے کوئی پوچھتا تو؟"

"اے چل بڑا آیا۔ ہم سے بڑھ کر تیری عقل ہو گئی شاید۔" اماں بڑے پیار سے ہنس کر

بولیں یہ بھلا پوچھتے بھی تو کیا جواب دیتا؟ کیا ناکر دیتا۔ ؟"

چھوٹے میاں نے منگنی کے بول پہنے تو سہی، مگر نئے نئے دلہوں پر ایسے موقعوں پر جو خوشی چھاتی ہے وہ ان کے چہرے پر دور دور تک نہ ملی تھی۔

بیٹی والوں کا منہ ان کے بس کا نہیں ہوتا۔ بیٹے والے کچھ کہیں تو جواب دیں۔ وہ منہ پھوڑ کر تو بول نہیں سکتے۔

" بات تو ہو ہی گئی تھی، اب بیٹی اُٹھا کیوں نہیں لیتے؟"

ادھر بیٹے والے ایسے ملے تھے کہ سر پر مہینے گزرتے جا رہے ہیں، نہ ہوں نہ ہاں۔ ادھر اُدھر سے پتہ بھی چلایا۔ مگر دکھل۔ پھر بڑی بس کی زبانی معلوم ہوا کہ چھوٹے میاں اپنی ٹریننگ میں اچھے ہوئے ہیں۔ ٹریننگ ختم ہوئی تو ملازمت کریں گے، پھر کہیں جا کر شادی وادی کے بارے میں سوچیں گے۔ صرف سوچیں گے، کرنے کا پھر بھی طے نہ تھا۔

باپ کا بچوں پر وہ رُعب تھا کہ ان کے سامنے آتے ہی کانپنے لگتے۔ اور ادھر وہ گھر میں گھسے اور بچے ادھر اُدھر کھسکے۔ خالو میاں چاہتے تو آج ہاتھ پکڑ کر مشورے تلے بٹھا دیتے "بول بے قبول ہے لڑکی؟" اور میاں جی کی اتنی مجال نہ ہوتی کہ ناپسند ہونے پر بھی انکار کر سکتے مگر خالو میاں نے جو دیکھا کہ چھوٹے میاں ٹریننگ کے بوجھ سے یوں ہی سوکھے جا رہے ہیں، بس ڈھیل دے دی۔

"کام کا بار آ پڑا ہے بے چارے پر۔ ایسے میں گرہستی میں الجھا دیں تو صحت بالکل ہی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ اور کیا ابھی سے بوڑھا تو ہوئے نہیں جا رہا ہے۔"

دیوروں، بھاوجوں کی محفل جمتی تو رنگا رنگی باتیں ہوتیں۔ منجھلی بہو سدا ساس کے دل پر چڑھی رہنا چاہتی تھیں اور موقع ملنے پر کوئی نہ کوئی ایسی بات ساس سے جا لگاتیں کہ وہ اُنہیں اور زیادہ چاہنے لگتیں۔ مگر اس دن خالہ بی نے بلقیس دلہن کی بات پر کان ہی نہ دیئے۔ جب اُنہوں نے جا کر سنایا:۔ "اماں سُنا کچھ، چھوٹے بھیا تو کہتے ہیں میں تمام عمر شادی ہی نہیں کروں گا!" ۔۔۔ اماں نے چونک کر دیکھا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا!"

"اے لو میرے دماغ کو کیا ہونے چلا ہے، چھوٹے میاں آپ ہی کہتے تھے۔ سو میں نے آپ سے کہہ دیا۔

"مگر کوئی وجہ بھی ہوتی !"

"اب یہ تو ان کا اپنا دل جانے۔"

"بات میں کوئی ڈھنگ بھی ہو مگر۔"

"بلقیس بی ہنس کر بولیں۔۔۔ اماں کہانی والے شہزادے کی طرح وہ تو کوئی شہزادی ہی لائیں گے۔"

خالہ جی بدک کر بولیں۔ "کیوں بالو کیا کسی شہزادی سے کم ہے۔"

"اب تو وہی جانیں جو انکار پر تلے بیٹھے ہیں۔"

بات یہیں ختم نہیں ہوئی، بس خالہ بی کے جی کو لگ گئی۔ چھوٹے میاں گھر میں آتے تو خالہ بی ایسی کوری کوری نظروں سے ان کا جائزہ لیتیں کہ اپنی جگہ وہ بھی ٹھٹھک ٹھٹھک رہ جاتے۔

ایک دن رات کے کوئی گیارہ بجے چھوٹے میاں گھر لوٹے۔ سب لوگ سو چکے تھے۔ ملازم باہر ہی سوتا تھا۔ اس نے بڑے دروازے کی کنڈی کھول دی اور یہ گھر میں آ گئے۔ خالہ بی کو تو مانوس قدموں کی چاپ سن کر سونا دوبھر ہو گیا تھا۔ سر اٹھا کر بولیں:۔

"کہاں گیا تھا چھوٹے میاں ؟"

چھوٹے میاں پہلے تو ذرا گڑبڑائے پھر سنبھل کر بولے "رات کا شو دیکھنے چلا گیا تھا۔"

"اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں ؟"

"بھول ہو گئی اماں بی۔ دوستوں نے گھیرا اور بس لے کر چلے ہی گئے۔"

خالہ بی نے بھی کوئی دھیان نہ دیا کہ جوان جی ہے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگرانی ٹھیک نہیں ہوتی۔ مگر اس دن کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ چھوٹے میاں کو روز ہی دوست گھیرنے لگے۔ کریم ان کا یار غار بن گیا کہ وہ دبے پاؤں راتوں کو آتے اور یہ دھیرے سے دروازہ کھول دیتا۔

رمضان کے تیس روزے ختم ہو چکے تھے۔ جمعہ کو عید پڑھنی تھی۔ جمعرات کی رات خالہ بی اپنی تمام بہوؤں کے ساتھ شیرخورمے اور سویوں کے لئے میوے تیار کرتی بیٹھی تھیں۔ ایسے کام کاج میں تو رات یوں بیت جاتی ہے۔ ادھر صبح ہی صبح ننھے بچے کپڑوں کے لئے غل غپاڑہ مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بڑے لوگوں کی بھی برابری کرنی ہوتی ہے۔ نمازیوں کی گڑبڑ، پھر خود عورتوں کے نہانے دھونے۔ سب مائیں اپنی اپنی بچیوں کے ریشمی رنگین

/

اور بچوں کے گلابی نیلے کپڑے اور اچکنیں نکال نکال کر اوپر ہی رکھ رہی تھیں کہ صبح صبح پھر گڑبڑ نہ مچے۔

چھوٹے میاں کو معلوم نہ تھا کہ آج گھر بھر میں رت جگا پڑا ہے۔ یوں ہی اپنے پیچھے دھیرے سے دروازہ بند کرتے ہوئے گھر داخل ہوئے تو سٹ پٹا گئے۔ چراغوں کی دھا دھم روشنی میں دیکھتے کیا ہیں کہ اماں تو بن کشن پہ کھوپرہ چھیلتی بیٹھی ہیں، اور بھابیوں نے مارے خوشی اور داودم کے رات کو دن سمجھ رکھا ہے۔

خالہ بی نے دیکھا ضرور، مگر ٹال گئیں۔ اگر بولنے پر اتر آتیں تو پھر بولتے ہی چلی جاتیں اور پھر صبح عید کا دن تھا کہ برس کے برس یہ دن آتا ہے۔ اگر فضوں میاں منہ پھلا کر بیٹھے رہے تو غصے غصے میں ساری خوشی ملیا میٹ ہو جائے گی۔ سمجھانے بجھانے کے اور بھی تو کئی دن ہوتے ہیں! بس اتنا ہی بول کر رہ گئیں :۔ "اے میاں یہ کوئی آنے کا وقت بھی ہوا؟ دیکھ لو دو ڈھائی سے کم کیا بج رہے ہوں گے؟ اور پھر اپنے کھانے دانے کا بھی کوئی خیال ہے کہ نہیں؟ روزہ کہاں افطار کیا تھا؟"

چھوٹے میاں کے دم میں دم آگیا۔ سانس لے کر بولے :۔ "ایسے ہی ایک دوست نے روک لیا۔"

"اتنی رات گئے تک؟" خالہ بی حیرت سے بولیں۔

"اور کیا، اتنا کہتا رہا جانے دو، جانے دو، مانا ہی نہیں، میں تو تب ہی چلا آتا تھا۔"

"اچھا دوست ہے موا۔" خالہ بی اتنا کہہ کر کھوپرہ گھسنے لگیں۔ کٹے ہوئے بن بیٹ کر انہوں نے تھال میں رکھ دیئے، اور خود جا کر سماوار سے ٹونٹی کھول دی اور وضو بنانے لگیں۔ خالہ بی ہر جمعرات کی رات کو سوتے وقت یٰسین شریف پڑھتی تھیں کہ گھر میں رزق کی برکت ہوتی ہے۔ بچپن کی عادت بڑھاپے تک ساتھ لے گئی۔ وضو بنا کر اٹھیں تو دیکھا کہ ان کا اپنا قرآن شریف طاق سے غائب ہے۔ چڑ کر بولیں :۔

"توبہ ہے ان بچوں نے کسی چیز کا ٹھکانا نہ رکھا۔ میرا کلام مجید کس نے اٹھایا؟" منجھلی دلہن کے بچے سارے گھر میں اپنی شرارت کی وجہ سے بدنام تھے، یہ طعنہ تو صاف ان ہی پر جاتا تھا۔ الجھ کر بولیں :۔ "ابا میاں لے گئے تھے، بھلا بچے کیوں اٹھاتے؟"

"اور ابا میاں کیوں لے گئے تھے؟"

"یہ وہ خود جانیں، کوئی کیا کہے؟"

بلقیس دلہن بولیں: "...اُنھوں نے اپنا دادا کا کلام مجید ایک مانگنے والے کو دے دیا۔ بے چارے کی ماں مر گئی تھی تو وہ کچھ پڑھ کر بخشنا چاہتا تھا، اور گھر میں کلام مجید نہ تھا، سو ابا میاں نے کلام مجید دے ہی دیا؟"

"اچھا کیا، مگر اب میں کاہے میں تلاوت کروں۔" گردن اونچی کر کے دیکھا تو طاقچے تک ان کا ہاتھ نہ جاتا تھا، آواز دے کر بولیں: "ارے چھوٹے ذرا یٰسین شریف تو اُٹھا دیو۔"

چھوٹے میاں آواز سُن کر آ تو گئے تھے، مگر یہ بات سُن کر وہیں رہ گئے۔ کھنکار کر بولے: "میں باوضو نہیں ہوں۔"

"اے میاں تو سامنے ہی تو سقا دار دھرا ہے، وضو کوا ایسے کون گھنٹے لگتے ہیں؟"

منٹ بھر تو یوں ہی اُلّوؤں کی طرح کھڑے رہے، پھر بولے:۔

"میں باہر سے ابھی منٹ بھر میں آتا ہوں۔"

اللہ جانے وہ منٹ کتنے گھنٹے کا تھا کہ خالہ بی کی شنگریاں دکھ دکھ گئیں۔ اب کر اپنی بہوؤں سے بولیں:۔

"دوئی دیکھا ری لڑکیو! میں یہاں کھڑی کی کھڑی ہوں اور وہ موا ایسا غائب ہوا کر پلٹا ہی نہیں۔"

بلقیس نے دالان والے کمرے میں جا کر کھڑکی سے مردانے میں جھانک کر دیکھا تو چھوٹے میاں خر خر کرتے پڑے سو رہے ہیں

آج خالہ بی کا ماتھا پہلی بار ٹھنکا۔ انھیں یاد آیا ابھی کچھ ہی دن پہلے حضرت کے نام کی فاتحہ دلوائی تھی، خالہ بی لاکھ بلاتی رہیں مگر چھوٹے میاں یوں ہی کر گا ٹھے پڑے رہے۔ ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بستر میں لمبے لمبے پڑے ہی رہے۔ لاکھ لاکھ ماں نے خوشامد کی:۔

"ارے موے فاتحہ میں تو شامل ہو جا، برکت اُترتی ہے۔"

کس کی فاتحہ؟ کہاں کی برکت؟ وہ تو ہلے بھی نہیں۔ بڑی دیر بعد اُٹھے بھی تو پہلے غسلخانے کی خبر لی۔ نہا دھو کر سفید براق کپڑے پہنے اور ماں سے آ کر بولے:۔

"کھلائیے کیا پکایا ہے!" خالہ بی نے غور کیا تو یاد آیا کہ صاحب زادے رات کو پھر

دیر سے لوٹے تھے۔

بھابیوں میں بات جا پہنچی اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ خالہ بی بھی جا پہنچیں۔

"اماں تو مانتی ہی نہیں، میں کہتی ہوں حضرت بُری باتوں میں پڑ گئے۔"

خالہ بی کو بھڑک کر منہ آگیا: "اے میں کہوں جوان بچہ ہے، گھر میں جو رو نہیں بچہ نہیں، ایسے میں اگر گانا وانا سننے کہیں چلا گیا تو کیا برائی ہو گی؟"

"گانے والے کا نام نہ لیجئے اماں بی" منجھلی دلہن بولیں،

"صاف سیدھی طرح کہئے ناکو ٹھے پر گئے تھے۔ فاتحہ تک میں تو شامل نہیں ہوئے۔ اور پھر یہ سب کیا ہے؟ راتوں کو گیارہ۔ بارہ، ایک سے پہلے تو لوٹتے نہیں۔ جپ نام کر رکھا ہے کہ ٹریننگ لے رہے ہیں۔ ٹریننگ ہے نہ وریننگ۔ دوسری ہی ٹریننگ لے رہے ہیں۔"

"ہاں، میں بھی آنکھیں رکھتی ہوں۔ اور کیا ہمنا ہم نے بھی ڈھیر سارے بچے کچھ یوں ہی نہیں جن لئے ہیں۔ ہزار بار دیکھا ہے کہ جب تک سنادھو نہیں نماز کے کمرے میں پھٹکتے تک نہیں ہیں۔ اسے تو کوئی اندھا بھی جان جائے کہ پانی کدھر کو بہہ رہا ہے۔ اب یوں کوئی آنکھوں پر پردہ ہی ڈالنا چاہے تو کیا کر سکتے ہیں؟" عزیز میاں کی بیوی نے صفا ساس پر چوٹ کی۔

عید کا دن نکلا، گھر بھر میں چہل پہل مچ گئی۔ رنگین ریشمی سرسراتے کپڑے، بچوں کی چیخم چاخ، خالہ بی کا نوکروں پر گرجنا برسنا، بیبیوں کے سنگھار پٹار۔ بس سارے گھر میں دھمک دھما ہونے لگی۔ یہاں وہاں، اِدھر اُدھر بس دھائیں مچ گئی۔

دستر خوان بچھا، پورا گھر آکر بیٹھا۔ خالہ بی نے طرح دے دی۔ اتنی اتنی باتوں پر دوبل کرنے سے بچے اور بگڑ بیل ہو جاتے ہیں۔ پیار دلار سے ہر ایک کو کھلا رہی تھیں۔ چھوٹے میاں کھا تو کیا رہے تھے، بس نوالے ٹونگتے بیٹھے تھے۔ خالہ بی نے بوڑھی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور سمجھا کر ٹال ٹال گئیں۔

چھوٹے میاں یوں کھا رہے تھے جیسے نوالے حلق میں اٹکتے ہوں۔ ماں نے جبر کرنا شروع کیا تو یوں ہی اٹھ کھڑے ہو گئے۔ "بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے اماں۔"

خالہ بی کے دل کو مستقل دھکڑ پکڑ لگ گئی۔

ذاکر میاں کی بیوی کو بس آج کے ہی چین تھی کہ گھر بھر کی صفائی کرتی پھریں۔ مہینے

پندرہ دن میں جہاڑو دے کر اُٹھتیں اور پورے گھر کو کھوڈ ڈالتیں۔ صفائی کرتے کرتے چھوٹے میاں کے کمرے کی باری آئی۔ کرسی ہٹائی، میز اُٹھایا، پلنگ اُٹھایا، الماری جگہ سے کھسکائی اور پھر جہاڑ ٹا جھٹک کر کے ایک ایک چیز سینت کر رکھنے لگیں۔ اتفاق سے الماری کا قفل رہ گیا تھا۔ پٹ کھولا، جالے گچھے گچھے بھرے ہوئے، نیچے اوپر دھول ہی دھول۔

"توبہ ہے اللہ! اتنی گندگی میں رہا کیسے جاتا ہے ان سے؟" الماری کے خانوں سے سامان اُٹھا اُٹھا کر نیچے رکھنے لگیں کہ خانوں کی صفائی ہو جائے تو چیزیں پھر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں۔ دیکھتی ہیں تو سامنے ہی شہد کی شیشی اور ارنڈ کے تیل کی چھوٹی سی بوتل، پھر اِدھر اُدھر ہاتھ مارا تو چھوٹے چھوٹے موزے اور ننھی منی دو تین نیکریں اور بنڈیں آگئیں۔

"ہائے اللہ! سارا سامان، جیسے کسی کی زچگی کی تیاری ہو" ان کی اپنی زچگی پہلی تھی تو پہلے ہی دن اماں جان نے شہد منگوایا تھا، اور پھر یہ ارنڈ کا تیل؟ چھوٹے چھوٹے کپڑے اور یوں الماری میں چھپائے ہوئے۔!

ایک ہی چھپاکے میں وہ دیورانیوں جٹھانیوں کے جتھے میں بیٹھی ساری روداد سُنا رہی تھیں۔

"اور کیا ہم نے بچے نہیں جنے؟"

"وہی تو میں کہوں کہ شادی کے نام سے نئے گھوڑے ایسا بدکتے ہیں۔"

"ڈال لیا ہے کسی لڑی بڑی کو اپنے گھر"

بات اتنی بڑی تھی کہ بلکے بیٹوں والی بہوؤں کے پیٹوں میں نہ رہ سکتی تھی۔ خالہ بی کو پھر بھی اپنا بیٹا ہی معصوم دکھائی دیا۔

"اے لو، مد ہو گئی! گھر میں بچے کچے ہیں ہی۔ خیال سے لے آیا کہ وقت پر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو جلد ہی مل جائے۔ ایک تم ہو کہ طومار باندھے لیتی ہو"

"وہ تو آنے والا وقت آپ ہی بتا دے گا۔ ہاں"

دوسرے دن محض ساس کی چوم چوٹ پہ ذاکر میاں کی بیوی نے الماری کا پٹ کھولا تو سب چیزیں غائب تھیں۔ مطلب یہ کہ حق، حقدار تک پہنچ گیا تھا۔

اس دن کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ آئے دن بہوئیں ساس کو قائل کرنے دیور کی چوری پکڑتیں۔ کبھی جیب سے چیپنی نکل رہی ہے تو کبھی کوٹ میں سے ربر کی چڑیا، کبھی مٹھائی تو کبھی نپل۔

خالہ بی جان بوجھ کر انجان بنی رہیں۔

خالہ بی کا ایک خیال تو اپنی جگہ یہ تھا کہ جان جوان جی ہے۔ اگر اِدھر اُدھر جھانک تانک کرے تو برائی نہیں بلکہ قابلِ معافی ہے۔ مگر چھوٹے میاں تو اتنے دیوانے بن گئے تھے کہ بیچ مچ کے دیوانے بھی ان کے سامنے سیانے تھے۔ اللہ جانے دل میں کیا سمائی، بانو کی معصوم جوانی پر رحم آیا یا خود اپنا ہی راستہ صاف کرنا تھا کہ پھوپھی کے یہاں جا پہنچے اور بولے:۔

"بانو بہن کے لئے میں نے ایک بہت اچھی جگہ بات لگائی ہے۔"

"بانو بہن!" پھوپھی بی حیرت سے چیخیں، "ارے میاں، ہونے والی بیوی سے بہن بھائی کا رشتہ باندھو گے تو نکاح کہاں قبول ہوگا؟"

"نکاح کرتا ہی کون کم بخت ہے؟ میں نے تو شروع ہی سے اسے اپنی بہن مانا ہے کیوں کہ اللہ نے مجھے خود کوئی بہن نہیں دی۔ وہی تو کہتا ہوں کہ بہن کا کچھ حق، بھائی پر لگتا ہے ایسی جگہ بات لگائی ہے کہ بہن بھی ساری عمر بھائی کو دعائیں دیتی رہے۔"

پھوپھی بی چھالیہ کی جگہ اپنی انگلی کتر گئیں۔ یہ گل بھی کھلنا ہی تھا، سو کھل کے رہا۔ بات چیت کا انداز ایسا سنجیدہ تھا کہ پھوپھی بی کو ہنسی مذاق کا کوئی پہلو نظر نہ آیا۔

چھوٹے میاں کے اپنے دوست تھے نسیم میاں، شہر میں تین تین دکانیں تھیں۔ عمر بھی بس ان کے لگ بھگ۔ چاہتے تھے کسی شریف خاندان کی کوئی بیٹی اٹھائیں۔ چاہے فیرجی کیوں نہ ہوں۔ باپ مدت ہوئی مر چکے تھے۔ لے دے کے ایک ماں تھیں یا یہ خود، جو بھی بیٹی بیاہی جاتی لعلوں کی لعل رہتی، صورت شکل بھی ایسی کوئی بری نہ تھی۔ انہوں نے پھوپھی بی کو ایسی لچھے دار باتیں سنائیں کہ وہ بھی راضی جیسی ہو گئیں۔ ارے اب جس کو بھرے دل سے بھر منہ سے بہن کہہ کر پکار لیا، لاکھ وہ خون کے رشتے بہن نہ ہوئی مگر پھر بھی بہن کا مان ہی اونچا ہوتا ہے۔ یہ تو حرام کرنا ہو گیا اور پھوپھی بی چھوڑ کوئی بھی اس بات پر کیا راضی ہو سکتا ہے کہ کسے کہ بہن کو بھائی سے بیاہ دیں۔ یہ تو دین دنیا دونوں میں روسیاہ کر دینے والی بات ہوئی۔ صاف صاف لفظوں میں چھوٹے میاں نے اونچ نیچ سمجھا دی کہ برائے خدا آپ بات کو یوں مشہور نہ کریں ورنہ لوگ تو ہوتے ہی ہیں ایسے کہ کسی کا بنتا کام بگاڑ دیں اور اس پر بھی یوں خوش ہوں جیسے کمال کر دیا ہے۔ کسی کا گھر جلے۔ بجائے بجھانے کے تاپنا شروع کر دیں۔

ایسے چپکا چپکی شادی کی تیاری شروع ہوئی کہ کسی کو پتہ بھی نہ چل سکا۔ سال چھ

مہینے کی بڑی ہوتے ہی جاتی تھیں۔ اب کے سے جو آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ سارے گھر میں بلو رہی ہوئی ہے، کپڑے گوٹے کے ٹھیپے کہ جیسے بازار کھلا ہوا ہے۔ بیٹھک میں سُنار بیٹھا ٹھک ٹھک کئے جا رہا ہے۔

ادھر گودام میں اناج کی اُٹھا پٹک ہو رہی تھی تو دیواروں پہ رنگ دار قلعی پھر رہی ہے۔ بات کا پتہ چلا تو ہک چک ہی رہ گئیں۔ مگر عقل سے سوچا تو پھر خوش ہو گئیں کہ چلو ٹھیک ہی ہوا۔

چھوٹے میاں کا کیا تھا! رات ڈھلے رات آنا، باؤلوں کی سی شکلیں بنائے پھرنا، نکھانے کی سدھ نہ پینے کا دھیان اور نہ ٹریننگ کے بعد بھی بڑے ملتے تو دو ہی تین چار سو کی میاں تو ارش ہوتی تھی اور بڑی بات یہ کہ لڑکا اتنی چاہت سے کر رہا تھا! ذاکر میاں کے بڑے بیٹے کے ختنے ہوئے تھے۔ پورے دوست احباب جمع ہوئے تھے، پھوپھی بی بھی۔ تو تیس چھوٹے میاں نے غالباً آگے ہی سب طے کر رکھا تھا۔ لیکا جھپکی میں باو کا دیدار شمیم میاں کو بھی کروا دیا اور وہ تھے کہ صحراؤں کی خاک چھاننے بنا ہی مجنوں ہو گئے۔

ادھر چھوٹے میاں کی ٹریننگ ختم ہونے میں دو ماہ رہ گئے تھے اور خالہ بی خوش پر خوش تھیں کہ چلو خدا لے وہ دن بھی لایا کہ اب چھوٹے بیٹے کے پھول کھلتے دیکھیں گے اب شادی ہو گی تو آپ ہی سنبھل جائیں گے۔ اس دن بچوں کے گھیرے میں بیٹھی ہنس بول رہی تھیں کہ باہر سے ڈاک اندر بھجوائی گئی۔ نیلے نیلے رقعے نظر آئے تو خالہ بی نے بہوؤں کو آواز دی۔

بلقیس بی نے ایک رقعہ اُٹھایا اور بھبک ہو کر بولیں :۔

"ہائیں! یہ تو بڑے بوجا کی طرف سے ہیں"

"کس سلسلے میں مگر!" خالہ بی چونک کر بولیں۔

"سلسلہ؟ سلسلہ یہی شادی کا ہے"

"ہائیں!" خالہ بی اور اچنبھے میں پڑ گئیں، "وہ بی کس کی شادی؟ کچھ آگے پڑھو گی بھی ـــ؟"

صاف صاف تو لکھا ہے ـــ" سنجلی دلہن نے ایک کنگورے دار گلابی رقعہ سامنے نچا دیا اور زور سے پڑھنے لگیں : ـــ

ساتواں شہزادہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریب

عقد سعید نورچشمی سلمہا

شرکت محفل عقد و تناول طعام کا متمنی

حاجی عنایت علی خاں

زمیندار

بتاریخ ۵ر ذی الحجہ ۹۷
روز پنجشنبہ بعد مغرب

مقام: لال حویلی
حیدرآباد دکن

خالہ بی الجھ کر بولیں :۔ "اے بی ڈھنگ سے پڑھو ذرا۔ کیا سُنا رہی ہو یہ؟
بلقیس دلہن کو غصہ آگیا۔ "تو بھلا میں ایسی نپٹ جاہل ہوگئی کہ شادی کا رقعہ بھی پڑھنا نہ آئے۔ پھوپھا میاں کی دو ہی تو بیٹیاں ہیں نا اماں بی، ایک بڑی بھابی اور ایک بانو۔ اب بھلا وہ اور کس کی شادی کا رقعہ چھپا سکتے تھے؟ اور پھر لال حویلی میں کون رہتا ہے؟"
"مگر لڑکا کون ہے؟ کیا پتہ ہمارا چھوٹے میاں ہی نہ ہو"
"اے واہ!" منجھلی دلہن کو ایسے بے موقع ہنسی آئی کہ خالہ بی کی تیوری چڑھ گئی، مگر وہ ہنستے ہنستے ہی بولیں :۔

"ہمارے دیورجی کی بات ہوتی تو کھلا کھلا نام ہی نہ چھپوا دیتے۔ یہاں تو جان بوجھ کر دونوں کے نام چھپائے گئے ہیں کہ کوئی بیچ میں ہاتھ نہ مار دے۔"
ممانی جان غصے میں بولیں : "لو اور سُنو، بھلا کہیں شریف لڑکیوں کے نام یوں رقعوں میں چھپا کرتے ہیں؟ ہزاروں غیر مردوں کی نگاہ نام پر پڑے تو کیا شرافت رہ گئی!"
منجھلی دلہن تیکھے پن سے بولیں۔ "بھلا نہ سہی دولہن کا نام، دولہے کا نام تو لکھوا سکتے تھے!"
ہو پرسے چھوٹے میاں کوٹ پتلون ڈالے، ہاتھوں سے بال برابر کرتے برآمد ہوئے تو دیکھا پوری پنچایت موجود ہے اور معاملہ خاصہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ سارا معاملہ سمجھ میں آگیا — ڈھٹائی سے بولے :۔ "ہاں ہاں بانو بہن کی نسبت ہمی سے لگائی ہے۔"
سسرال میں بانو کی لاج کھلوائی بھی ہوئی۔ ساس مرودے بول چال بھی شروع ہوگئی مگر

ادھر اتنے دن گزرنے پر بھی خالہ بی کے رویے میں کوئی فرق نہ پڑا۔ ان کا جی تو ہر لمحہ یہی چاہا کرتا کہ بس چلے تو اپنے ہاتھوں اس کلموہے کا گلا گھونٹ دیں۔ مگر پھر سوچتیں کہ کیسے درد دل سے پیٹ پھاڑ کر جنا تھا تو ہاتھ مل کر رہ جاتیں۔ بھابیاں تو خالہ بی سے صاف کہتی تھیں:۔

"کسی ایسی ویسی کو گلے باندھ لیا ہے۔"

اب خالہ بی کا یہ حال کہ جو بھی کہے سن لیں اور منہ نہ ہلائیں۔ مگر غصے کے اظہار کا یہ طریقہ انہیں خود ہی نہ بھایا اور اب یہ چلن اٹھایا کہ آتے جاتے چھوٹے میاں کو تیز تیز نظروں سے دیکھا کرتیں۔ بہوؤں کی منڈلی میں بیٹھ کر ایک دن کہا بھی:۔

"میرے بیٹے جی کون حرام زادی ہے، ذرا اس گھر میں قدم دھر کر تو دیکھے۔"

کہاں تو چھوٹے میاں شہزادے بانتے تھے کہ شہزادی بدرِ کمال کو بیاہنا پڑا تھا یا اب یہ عالم کہ اللہ جانے کس سڑی ماری کو گلے کا تعویذ بنا رکھا تھا کہ نکالتے نہ بنتا۔

بات اب تک بھی ڈھکی چھپی تھی، کسی کو معلوم نہ تھا کہ اصل بھید کیا ہے۔ خالہ بی کے دل کو یہی آس تھی کہ بات کچھ بھی نہیں، کوئی رکھی رکھیلی ہے دراندڑ رنڈی، بس چپ ہی بھلا اپنا گھوم رہا ہے۔ چار دن گھومے گا پھرے گا تو آپ ہی آپ رستوں پر آ جائے گا۔ اور ایک آدھ دن کسی بھاوج کا پلو پکڑ کر کہے گا:۔

"بھابی ماں اب ہماری بھی کرا دو نا۔"

بیٹی غریب کی ماں کا تو یہ حشر ہوتا ہی ہے کہ ہر ایک پوچھ پوچھ کر ناک میں دم کر دیتا ہے، "وہ کیوں بیٹھی ہے! کیوں بیٹھی ہے۔" مگر کماتا کھاتا جان جوان بیٹا بھی اگر یوں ہی ڈھکیلیاں کھاتا دکھائی دے تو ماں کی جان ضیق ہو جاتی ہے۔ خاندان میں لڑکیوں کی مائیں بھی تو تھیں ہی، اپنی اپنی بیٹیوں کا عیب ہی ماؤں کو نظر آتا ہے۔ وہ کیسے نہ میں! کبھی کبھار خالہ بی کا جی چاہتا اٹکنا کر بول ہی دیں ہنہ۔

"شادی کے قابل ہی نہیں تو کیا کرے شادی۔"

اتنے پر بھی خالہ بی تیرے گئے بیٹھی تھیں کہ ڈھنگ کی لڑکی دکھائی دی تو بس حضرت کو کس ہی دوں گی۔ مگر حضرت تو ایسے تڑ پھڑے تھے کہ پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے۔

گرمیوں کی چاندنی راتوں میں جب شام ڈھلتی اور رات اٹھتی تو سارا آنگن مہندی کی پی کلیوں اور موگرے، موتیا کی کلی۔ ادھ کھلی کلیوں اور پھولوں سے مہک مہک اٹھتا۔ سارے بچے جمع ہوتے اور کھیلا گود مچتا۔ چھوٹے میاں تھے تو وہ بھی بچپن کے اگر بھتیجوں بھتیجیوں سے مل جل کر

بس بچے ہی رہ جاتے۔ اس رات خالہ بی سفید چاندنی بچھے تخت پر چھالیہ کترتی بیٹھی تھیں۔ بہوئیں ادھر ادھر پلنگوں پر ہنسی دل لگی کی باتیں کرتی پڑی تھیں۔ بچے سارے میں شور مچا رہے تھے کہ ادھر سے چھوٹے میاں نکل آئے۔

ساروں نے چھوٹے میاں کو جا لیا۔

"چچا میاں کہانی، چچا میاں کہانی۔"

"ارررے" وہ کوٹ کا دامن جھاڑتے ہوئے بولے۔ "یہ کوئی وقت ہے کہانی سننے اور سنانے کا؟ پھر کبھی نا۔"

"اے لو! اور کون وقت ہوتا ہے کہانی کا؟" منجھلی بھابی تنک کر بولیں۔ "پھر کیا صبح سویرے کہانی سنایا کرتے ہیں؟ چھ ہاتھ کے چچا بنے ہو، کبھی تو بچوں کی بات مان جایا کرو۔"

"اچھا، اچھا" وہ ہنستے ہوئے وہیں جم گئے۔ "یوں خفا کیوں ہو رہی ہو آپ؟ تو بھئی ہوا ایک تھا بڑا خوبصورت شہزادہ اور ایک تھا وزیر زادہ۔ دونوں کا دل ہی نہ لگتا تھا۔ بس جناب شہزادے نے پالا ایک طوطا اور وزیر زادے نے پالی ایک مینا۔ بڑی خوبصورت سی کہ بس دیکھتے ہی جاؤ۔"

"میرے جیسی چچا میاں؟" صالحہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ سارے بچے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ چھوٹے میاں بھی ہنستے ہنستے سارے چہروں پر نظریں دوڑانے لگے گویا دیکھ رہے ہوں مینا کس جیسی تھی۔

"بڑی پیاری سی تھی بھئی وہ۔ منی سی۔ گڑیا سی۔ بس جیسے اپنی کاکل....."

جانے کون سی رو میں چھوٹے میاں کیا کہہ گئے کہ ایک دم سے سٹ پٹا گئے۔ اور ادھر پوری فضا میں گھبرا جانے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بھابیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں اور خالہ بی کے ہاتھ کا سروتہ یوں ہی ٹھٹکا کا ٹھٹکا رہ گیا۔ اتنے سارے بچوں میں ایک کا بھی نام کاکل نہ تھا۔ اور کیسا انوکھا سا نام تھا؟ بھئی نام ہوا کرتے ہیں رابعہ، کلثوم، صالحہ، مریم، شاکرہ، زہرہ، سلمیٰ، یہ کون نک ہے کاکل۔۔۔؟

خالہ بی کو اپنا ماں ہونا یاد آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک تناکے کے ساتھ اٹھیں اور عین چھوٹے میاں کے سر پر پہنچ کر ان کے بال ہاتھوں میں کھسوٹ ڈالے۔

"بول یہ کاکل کون ہے تیری چہیتی سہیلی؟"

چھوٹے میاں کے منہ پر رنگ سا چھا گیا، بڑی مضبوط آواز میں بولے :۔
"میں نے دو سال ہوئے شادی کر لی ہے اماں۔ اور کاکل آپ کی پوتی ہے اور میری بیٹی۔"

چھوٹے میاں اگر جھوٹ بولتے یا بہانہ تراشتے تو خالہ بی کے غصے کو راہ مل جاتی، مگر انھوں نے اتنا بڑا۔ بے باک سچ کر دیا کہ خالہ بی کے ہاتھ ہی ڈھیلے پڑ گئے۔

"شادی کر لی ؟"، وہ مرے مرے لہجے میں بولیں، "مگر کس سے ؟"

"میرے ماتحت ایک کلرک ہیں، ان کی بیٹی ہے اماں۔ بہت غریب لوگ ہیں اماں، بڑی اچھی لڑکی ہے۔ آپ بھی ..... ؟"

خالہ بی کا رکا ہوا غصہ پھر بھڑک اٹھا۔ "ہاں ہاں غریب ہے۔ مگر بہت اچھی ہے۔ ہو چھنال کی ایک چھنال ہوگی۔ ورنہ یوں بغیر گاجے باجے کے بچہ جن لیتی ۔"

چھوٹے میاں کا منہ تپ گیا۔ سامنے ہی بھتیجے بھتیجیاں کھڑی تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں میں ڈگڈگانے لگے۔ بڑا دل کر کے بولے ،۔

"قسم خدا کی اماں آپ نے مجھے جنا ہے اور آپ کا اس سے بھی بڑھ کر حق لگتا ہے کہ جو چاہیں کریں، جو چاہیں کہیں ۔"

گھر کی ہستی گاتی فضا میں ایک زکار کا بن ڈگیا۔ بچے قصور کرتے ہیں تو ماں باپ معاف کر ہی دیتے ہیں مگر قصور بھی قصور جیسا ہو! یہ نہیں کہ زندگی جیسی زندگی کا ساتھ، اور ہاتھ پکڑ لیا ایک کلرک زادی کا! جس کے خاندان کا پتہ نہ بڑے بھلے کی خبر۔ خالہ بی کا غصہ بجا تھا۔ بھابیاں منہ دے کر باتیں کرتیں، بھائی کھنچے کھنچے رہتے۔ اتنے بڑے کنبے میں رہتے سہتے بھی چھوٹے میاں خود کو اکیلا اکیلا محسوس کرتے۔

برسات کے دن لگے، بدلیاں چھاتیں، برس جاتیں، کبھی چھاتیں اور ہوا کے زور سے بکھر بھی جاتیں۔ موسم بدلا تو سب کی طبیعتیں بھی بگڑنے لگیں۔ بچوں پر زیادہ زور پڑا۔ ناکیں سر سرانے لگیں، ٹھوں ٹھوں کھانسنے لگے، آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

خالہ بی کی اپنی ایک چھوٹی سی الماری تھی، اس میں ہاتھ کی بنائی ہوئی، گھر کی تیار کردہ دوائیں رہتیں۔ کھانسی زکام سے لے کر چھینے بخار اور پھوڑا پھنسی تک سبھی بیماریوں کی دوائیں۔ بڑے تایا طب کرتے تھے اور ان سے نسخے خاندان بھر میں چلتے تھے۔ ہاسپٹل کی دوا سے تو خالہ بی کا پرانا بیر تھا۔ سو گھروں پانی ملا دیتے ہیں کیا فائدہ کرے گی ؟ کوئی مارے ترقی پسندی کے دواخانے کی لال پیلی دوا لے بھی آتا تو ہری ہی سے پو اشتی دیکھ کر جان جاتے کہ خالہ بی نے بیمار ہی ہوگی۔

ساتواں شہزادہ

پچھلے چار پانچ دنوں سے چھوٹے میاں اپنے آپ میں نہ تھے۔ کھوئے کھوئے سے، بجھے بجھے سے۔ آنکھیں سرخ اور جاگی جاگی سی، بال اُلجھے بکھرے۔ عجیب بولنوں کی سی صورت بنائے پھرتے تھے۔ کسی سے بول نہ چال، بس اپنے کمرے میں پڑے ہیں۔ صبح ہوئی باہر گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے آگئے پھر شام کو پانچ بجے کی بجائے رات کے گیارہ بارہ اور کبھی تو دو بجے کی خبر لاتے۔ زندگی کا معمول عجب بدلا بدلا سا ہو گیا۔

صالحہ کی کھانسی نے زور پکڑا تو دادی کو ہول ہو گئی۔ جھنکی پڑیا تو جاری ہی تھی، ڈاکٹرین نے ڈرا دیا: "اسے تو کالی کھانسی ہے۔ پہلے کو شروع میں علاج کرو ورنہ جو بڑھ بیٹھ گئی تو بٹیا عمر بھر کو گنگانی ہو جائیں گی۔"

رات کے گیارہ بارہ کا وقت تھا۔ خالہ بی نیند بھری آنکھوں سے اُٹھ کر الماری والے کمرے کو چلیں۔ ابھی دروازے ہی میں تھیں کہ لگے اُجالے میں دیکھتی ہیں کہ اُن کے اپنے کمرے سے چھوٹے میاں شیشی پکڑے نکل رہے ہیں۔ ماں کو آتا دیکھا تو بوکھلا سے گئے اور شیشی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ماں نے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔ آنکھوں کی سرخی کا تعلق دل کے درد سے ہوتا ہے، چھوٹے میاں کی آنکھ سرخ تھی دل نے درد ضرور دکھایا ہو گا۔ اماں نے جھک کر فرش کو دیکھا۔ سارے میں کالی کھانسی کی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کلپ کر کو سا دیا۔

"جیسے گوروں پر پیدا ہوئی ہے، ایسے مر بھی جائے۔ ہونہہ! — علاج ہو رہے ہیں لاڈنی کے۔ ہمارے خاندان میں ٹیک لگادی کمبختوں نے۔"

سورج اور چاند کسی کی راہ نہیں دیکھتے۔ چڑھتے اُترتے رہتے ہیں۔ دن تو گزرتے ہی ہیں اور گزرتے ہی رہے۔ ماں بیٹے کے بیچ خفگی اور غصے کی جو دیوار کھڑی تھی وہ جوں کی توں ہی رہی۔

سرما کے دنوں میں پھلوں کا خوب موسم ہوتا ہے۔ خالہ بی نے ڈھیری سرخ سرخ گاجریں خریدیں، ان کے بن کش کئے، ساس بہوؤں نے مل جل کر دیگچہ چڑھایا۔ گھر کی بھینسیں تھیں۔ کھویا خوب تھا۔ سیر دو سیر کھویا بھی اس میں لنڈھا دیا۔ وہ مزے کا حلوہ بنا کہ چار گھر دور تک خوشبو اُڑ اُڑ گئی۔ دسترخوان بچھا۔ سبھی بیٹھے۔ نوکر چھوٹے میاں کو بھی بلانے گیا۔ مگر وہ اپنے کام میں اُلجھے ہوئے تھے، بولے: —

"میرا کھانا یہیں پہنچا جا۔"

جب سے اُنھوں نے خالہ بی کی چھاتی پر سل رکھ دی تھی یہ ان کے بڑے جیسے یہ نہ بولتی تھیں۔ جھپا کتے تھے اکر دیتیں۔

"مرو کر جیو، ہمیں کیا لینا ہے؟" اور ادھر چھوٹے میاں سچ مچ مچھلی کا کانٹا ہو کر رہ گئے تھے کہ مچھلی کا انگ ہوتا ہے مگر کوئی منہ نہیں لگاتا۔

نوکر نے کھانے کا طشت ان کے کمرے میں پہنچا دیا۔ ابھی سرپوش اٹھایا بھی نہ تھا کہ الائچی اور گھی کی خوشبو سارے میں پھیل گئی اور ناک سے ہوتی دل میں اتر گئی۔ سرپوش اٹھا کر دیکھا:۔ گہرے سرخ رنگ کا حلوہ، چاندی کے ورق لگے ہوئے۔ ابھی چھوٹے میاں نے ایک چمچہ اٹھا کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ کوئی حلق میں آ کر اٹک گیا۔ ہاتھ ویں ہی چھوڑ دیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ باہر سب کھانے میں مگن تھے۔ برتنوں، چمچوں اور رکابیوں کی کھڑ دھڑ ہو رہی تھی: جلدی سے اٹھے، اخبار میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکالا اور پلیٹ اٹھا کر اس میں پیٹ لی۔ جیب سے دستی نکال کر پوٹلی سی بنا لی اور الماری میں رکھ خود طشت کے پاس کھڑے کھڑے الٹے سیدھے نوالے ٹھونسنے لگے۔

خالہ بی عشاء کی نماز پڑھ کر لیٹی تھیں۔ ابھی ابھی گھر بھر کے چراغوں کی لو نیچی کر کے گئی تھیں اور سارے میں ملگجا ملگجا سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے بستروں پر پہنچ گئے تھے۔ چھوٹے میاں نے ادھر دروازے میں سے جھانکا، سامنے دیوار پر ان کے سر کا سایہ ابھرا اور پھر اندر ہو گیا۔ خالہ بی کی بند ہوتی آنکھیں کھل گئیں۔ پھر دھیرے سے چھوٹے میاں نے پوٹلی اٹھائی اور کمرے سے باہر ہو کر پٹ اندر بھیڑ دیئے۔ چپکے چپکے قدم اٹھا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایسا ڈنڈا دیا کہ پوٹلی دھپ سے نیچے جا گری اور اسی دم تین چار ٹکڑوں میں ٹوٹ ٹاٹ گئی۔ انہوں نے پیٹھ موڑ کر پیچھے دیکھا، خالہ بی کانپتی کھڑی تھیں۔ گرجدار آواز سے بولیں:۔

"ارے ہتیا پیاروں پیٹے حلق میں اٹک جاتے ہیں نا! خبردار! جو دانہ بھی باہر نکالا۔ حضرت کے نام سے فاتحہ دلوائی تھی تو ایسے حرام خوروں کے لئے نہیں۔"

چھوٹے میاں نے کچھ کہنے کے لئے سر کھولنا چاہا! مگر وہ پیر بخشی اپنے بستر تک پہنچ چکی تھیں۔

چھوٹے میاں کے جی کو جیسے روگ لگ گیا۔ ہونٹوں کی ہنسی جیسے کسی نے چرا لی۔ کہاں تو وہ ہونٹ کہ سدا پھولوں کی طرح کھلے رہتے یا اب یہ حال کہ آنکھوں میں شبنم سی گھلی رہنے لگی۔

بڑے بھائی جان تھے، پھر اختر بھائی، اچھے بھیا، عزیز بھائی، ذاکر بھائی، پھر چھوٹے بھیا کہ گھر بھر میں ان کے اور ان کی بیویوں بچوں کے قصے اچھلتے رہتے۔ اماں کو ہر بات کا چاؤ چونچلا۔ کوئی دن نہ گزرتا کہ کسی کی سالگرہ نہ ہوتی ہو۔ کسی کا عقیقہ ہے تو کسی کی چھٹی۔ کسی کا ابٹن ہے تو کسی کی دودھ بڑھائی۔ بھابیاں ایک سے ایک رنگا رنگی کپڑے پہنتیں۔ زیور سے سجی بنی، ہنستی بولتی گھومتی ہیں اور بھائی میاں

کر کھلے خزانے دھڑ دھڑ سے دروازے بند کرتے ہیں۔ دُلہنوں کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں اور علی الاعلان حمام تیار کرواتے ہیں۔ ایک چھوٹے میاں تھے کہ چوروں کی طرح راتیں بتاتے۔

کا کل سال بھر کی ہونے کو آئی تو باپ کو چونچلا سوجھا۔ سال پورا ہونے میں تین دن رہ گئے تھے۔ پاس میں کیا دھرا تھا؟ ٹریننگ ورننگ گئی سب چولہے بھاڑ میں، دل پر ایسا بتر آ پڑا تھا کہ کسی بات میں نہ رہے۔ کوئی بات ڈھنگ سے نہ کر پاتے۔ باپ تھے کہ ماں کے کہے میں، اور جب ماں نے ہی ہر طرح سے پابندی لگا دی تو کیا ہوتا ڈھیلا بھی ہاتھ پڑتا ہاں بس انگلی میں زمانے سے سونے کی نو ماشہ کی انگوٹھی پہنے رہتے ہیں، سو طے کر لیا ہے کہ رانی بٹیا کی سالگرہ اسی سے رچائیں گے۔

دل امیروں کا بھی ہوتا ہے اور غریبوں کا بھی۔ ارمان تو سبھی کو لگے ہوئے ہیں!

دکانوں دکان گھومتے رہے۔ موتیوں کا ہار، سستی قیمت کا ریشم کا سلا سلایا فراک، ننھے منے سرخ جوتے اور چاکلیٹ کا ایک ڈبہ، بطور تحفہ کافور کی گڑیا۔ سارا سامان الماری میں ڈرپ کر کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے کہ بچوں میں سے کسی کی نظر پڑ گئی کہ چچا میاں کی الماری میں تو رنگ برنگی دوکان سجی ہے۔ تمام گھر والے میں بوم ہو گئی کہ او بھئی اب تو ایسے ڈھیٹ ہو گئے ہیں کہ دن کی روشنی میں اپنی کمیلی کے لاڈوں کو بجانے کے جتن کرتے پھرتے ہیں۔

ایک منہ سے نکلی اور دوسرے سے سنگت بیٹھی۔ گھر تھا کیا سوا اچھا خاصا چھلنی تھا کہ ادھر بات پڑی نہیں کہ ادھر ٹپک پڑی۔ خالہ بی دراتی ہوئی کمرے میں پہنچیں۔ بڑے سلیقے سے خریدا گیا تھا سارا سامان سے تھما تھما سا سرخ فراک، چھوٹے چھوٹے لال لال جوتے، مالا، چاکلیٹ کا چپٹا سا ڈبہ۔ ایک چپٹے کے ڈبے پر ایک چٹھی لگی ہوئی تھی۔

"یہ کیا لکھا ہوا ہے رے؟" انھوں نے ڈپٹ کر نسیم میاں سے پوچھا۔

"جی .... جی دادی اماں ابھی پڑھتا ہوں" وہ اٹک اٹک کر سنانے لگے "ننھی گڑیا کی سالگرہ پر — ارمان بھری پہلی سالگرہ پر۔ اس کے باپ کی طرف سے"

خالہ بی نے سارے سامان پر نظر کی اور جیسے گھی میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ایسے پڑ گئے۔

"لو اور سنو! چھٹی نہ چھلے سوئے حرامی پلے۔ ہماری نقل میں سالگرہیں پڑتی ہیں۔" اور خالہ بی نے ایک لات جوتوں کو ماری، ایک ہاتھ سے فراک کھسوٹا۔ مالا اور چاکلیٹ کا ڈبہ زمین پر رہنے گے اور رہی سہی ہاتھ کی صفائی ڈبے پر ہو گئی۔ ڈبہ دور جا گرا اور اس میں سے بڑی سی کافور کی گڑیا نکل کر دو گڑیاؤں میں بٹ گئی۔

آنسو بزدلی کی نشانی ہیں اور غصہ بغاوت کی۔ مگر اُس دن تو چھوٹے میاں کی آنکھ بھی نم ہوئی اور غصہ بھی بے جا آیا۔ یوں دکھانے کو تو ہاتھ بھر لمبی ناک دکھا دیتے مگر گھر دار الگ ڈھونڈنے کی سوچتے تو اتنا کس بل کہاں تھا؟ ابھی نہ کمائی کا کوئی ٹھور ٹھکانا تھا اور کوئی دوسری آمدنی۔ ورنہ جی تو یہی چاہا کہ اک دم سے گھر چھوڑ کر چل ہی دیں۔ سالگرہ کی کیسی مٹی پلید ہوئی؟ خود پر ہی غصہ آیا کہ جلدی میں سب سامان کھلا چھوڑ کر چلنا بنا، ورنہ کسی کے فرشتوں کے بھی پتہ نہ لگتا۔ گڑیا کے ٹکڑے دیکھ کر رات بھر دل میں رہ رہ کر ٹیسیں اُٹھتی رہیں۔ "اب اس گھر میں نہ رہوں گا" اُنھوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا۔

جس دن کا کل بیٹا کی سالگرہ پڑتی تھی باپ اپنے کمرے میں منہ لپیٹے چپکو بکو روئے جاتے تھے!

مردوں کا ادھر اُدھر نگاہیں جھکانا عام سی بات ہے۔ اور کنواروں کا کیا ذکر ہے۔ اچھے گھر بھر کے بچے ہیں، بیوی ہے۔ ایسوں کو بھی کبھی باہر کی چاٹ لگی تو کوٹھا جا بسایا۔ اس میں حیرت کی بات ہے نہ غصہ کی۔ مرد کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے۔ خود خالو میاں کا حال کیا ڈھکا چھپا ہے۔ نوکری کے بہانے سال چھ مہینے دو چار دفعہ باہر کی ہوا کھاتے ہی تھے اور دوسری ہی نوکری دیکھ کر لوٹتے تھے۔ مگر ایسا بھلا کہاں ہوتا ہے کہ ایسی ویسی عورتوں کو سر ہی چڑھا لیا جائے۔؟ دل آ جانا بھی بڑی بات نہیں۔ اللہ نے آنکھ دیکھنے کو دی ہے اور اگر چلتے پھرتے کوئی چاند سی صورت آنکھ میں بھر گئی تو کیا ہوا؟ مگر یہ تو بڑی بات ہوئی کہ اس کو گھر کی رانی ہی بنا ڈالیں!

بھلے سبھاؤ میں ایک دن منجلی بہو نے ساس کو رائے دی بھی۔ یہی کہ چھوٹے بھیا کو معافی دے دیں مگر خالہ بی کا بھی وہ حال تھا کہ چولہا تو مدت ہوئی بجھ چکا تھا، مگر تپش ابھی تک باقی ہی تھی۔ ذاکر میاں کی بیوی کا کہنا تھا کہ مرد چھوٹے میاں کی بیوی اچھے گھر اور اچھے عادتوں کی ہے، تب ہی تو وہ اب تک اُس سے لگے ہوئے ہیں۔ ورنہ مرد لوگ تو جہاں کوئی کھوٹ خرابی دیکھتے ہیں۔ بس جی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور گُن ہے دل کی بھی بری نہیں۔ اُنھوں نے پچھلے دنوں کا واقعہ یاد دلایا کہ سردی کا زور ہوا تو چھوٹے میاں بڑے بھائی جان، اچھے بھیا اور عزیز بھائی کے گود کے بچوں کے لئے ہلکے نیلے رنگ کے اُون کے بُنے ہوئے چھوٹے چھوٹے موزے اور ویسی ہی ٹوپیاں لائے تھے بھابیوں نے پوچھا بھی:۔

"کہاں سے لائے میاں؟ کیا قیمت ہے؟"

تو ذرا مسکرا کر بولے:۔ "میرے دوست کی دکان ہے۔ وہاں سے لے آیا ہوں" بھلا کون دوست ایسا ہی والا تھا کہ گھر بیٹھے بیٹھے میں اپنا نقصان کرواتا؟ اور منجلی بھابی نے جو نوٹ کی

تو صاف پہچان لی کہ گھر کی ہی بنائی ہے۔ اب ظاہر ہے یہ اسی کا کام ہو سکتا ہے، ورنہ اور کس کا پیپر ملا اچھلے گا۔؟

مگر وہ تو خالہ بی تھیں اپنے نام کی۔ مرتی مر جاتیں مگر کبھی یہ رسوائی نہ کرتیں کہ غیروں کی بیٹی ان کی ہو سکتی ہے۔ اور غیر بھی کیسی کہ جس کے خاندان کا اتہ پتہ نہ ذات پات کی خیر خبر۔ کیا غیروں کی بیٹیاں نہیں اٹھایا کرتے؟ مگر وہ بھی ذرا تمیز سے، دیکھ بھال کے۔ ایسے نہیں کہ بس، دھیئی کو دیکھا اور آنکھوں کا کاجل بنالیا۔

اس دن تو خالہ بی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ گھر بھر میں بچے ادھم مچا رہے تھے اور تمام مائیں بیٹھی خوش ہو رہی تھیں۔ بیٹے اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ باہر بھی نکل آتے کام سے، پھر اندر چلے جاتے کیسی چہل پہل تھی! ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں۔ بڑا سہانا سہانا سماں تھا۔ اور تو سب تھے بس چھوٹے میاں ہی وہاں نہ تھے۔

خالو میاں نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر رک رک کر بولے:۔

"ابھی میں کہتا ہوں بچے غلطیاں کرتے ہی ہیں۔"

خالہ بی سمجھیں ان کھیلتے بچوں میں سے کسی نے شرارت کی ہوگی، اس پر کہہ رہے ہوں گے۔ بولیں:

"ہاں اور بچے کرتے بھی کیا ہیں؟"

بلب خوش ہو گئے۔ سمجھے بات بن گئی۔ بولے:۔ "وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ اب ہوا سو ہوا۔ جوان بچہ ہے، جان پر کھیل گیا تو کیا کریں گے؟ آنے دو گھر میں چھوٹی بہو کو بھی؟"

خالہ بی نے تڑک کر ان کی طرف دیکھا۔

"اے وہ بیٹے کی پشت پناہی ہو رہی ہے۔ ہوتا ہوگا تمہارے بڑوں میں کہ جیتیوں کو گھر ڈال لیں، میرے ہاں ایسا ہوا تھا نہ ہوگا۔ میں بھی سمجھی کیا کہنے جا رہے ہیں۔ اچھا ہوا جو میرے سامنے کہتے ہو تو ــــ سامنے قبلہ ہے، ہاں سچ کہتی ہوں باولی میں چھلانگ لگا دیتی۔ غضب خدا کا ذرا دیکھو تو کیا دن آیا ہے کہ دیدوں کے سامنے ایسی واہیات حرکتیں ہوں اور ہم مان بھی جائیں۔ سچ سناتی ہوں رکھنے کو ساتھ بٹھا کر کھلاؤں پر اُس حرامزادی کو اپنے در پر نہ پھٹکنے دوں کہ میری کوکھ کی بدنامی بیٹ رہی ہے۔"

خالو میاں چُپ رہ گئے۔ حیل حجت زیادہ کرتے بھی نہ تھے۔ وہ خود بڑے سخت قسم کے آدمی تھے۔ پر روایتی بادشاہوں کی طرح انھیں بھی ساتواں شہزادہ بے حد عزیز تھا۔ بچپن میں بڑے بچوں کو مارا ہو تو مارا ہو، چھوٹے میاں کو تو کبھی دھکا بھی نہ دیا۔ کیسی ہی ضد کیوں نہ کرتے پوری کر دیتے۔ ادھر

ماں بگڑتیں بھی تو کہتیں کر چپ کرے کو دو کوڑی کا کر دو گے۔ مگر ان سے سہار کہاں ہوتی کہ چیز سامنے دھری ہے اور بیٹا بلکتا رہے۔

اب بھی ان سے کہاں سہار ہو رہی تھی؟ بیوی تھی کہ چار گھر پرے کی تھی اور بیٹا تھا کہ زنان بیلو سوتا تھا اور مرد ہوتے بھی عورتوں کی طرح بلکتا تھا۔ مگر زیادہ نہ رو پاتے بھی نہیں۔ جانتے تھے خالہ بی منہ کی بگڑی ہیں، بات غصے کی ہو یا مذاق کی، جو کہتیں پورا کر دکھاتیں۔

رمضان کی عید آئی اور اسی زور شور سے آئی، جیسے ہر سال آئی تھی۔ گھر بھر میں وہی چہل پہل مچ گئی۔ بچے اپنے کپڑے لے لے کر بھاگ رہے ہیں۔ مائیں ڈانٹ رہی ہیں۔ ادھر خالہ بی کی نوکروں پر پڑتال پڑ رہی ہے کہ نمازی عیدگاہ جانے کو تیار بھی ہو گئے تو کسی کام کا ٹھکانا ہی نہیں۔ ادھر لڑکیاں ہاتھوں کی مہندی چھڑا رہی ہیں تو بیٹے نہا نہا کر نکل رہے تھے اور رول مچا رہے تھے۔ کوئی کمربند جھنے کی شکایت کر رہا تھا تو کسی کو اپنا جوتا ہی نہ ملتا تھا۔ کسی نے اپنی اچکن کے بٹن نیچے اوپر لگا لیے تو کسی کا ازاربند ٹخنوں تک لٹک رہا ہے اور اسے کوسنے تک کی بھی سدھ نہیں۔

اتنے ہنگاموں میں ایک چھوٹے میاں بھی تھے کہ خاموش تھے۔ اٹھے، چپ چاپ غسل کیا صاف کپڑے بدلے اور نماز گاہ کو چل دیے۔ اس بیٹے کا مدت سے بولا بند سا تھا۔ نہ یہ ان سے بات کرتی تھیں نہ وہ خود ہی رخ دیتے تھے۔ عید کے دن تو بڑے دشمن بھی گلے مل لیتے ہیں۔ یہ تو اپنے پیٹ کی اولاد تھا۔ مگر چھوٹے میاں نے آ کر سلام کیا تو خالہ بی نے منہ پھیر لیا۔ گلے لگاتیں تو دعا دینی ہی پڑتی۔

"خدا بڑی عمر کرے سہرے کے پھول کھلیں۔"

مگر سہرے کے پھول تو آگے ہی کھل چکے تھے اور کس کے نام سے؟ غصہ کی ایک لہر اٹھی اور ان کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ چور نگاہوں سے بیٹے نے ماں کو دیکھا۔ غصے میں دھاں بھوں، دھاں بھوں کر رہی تھیں۔ چپکے سے اپنے کمرے میں جا پڑے۔

خالہ بی کھلانے پلانے کے انتظام میں لگ گئیں۔ سب ہی لوگ عیدگاہ سے واپس آ چکے تھے سات بیٹوں کی ماں، چھ بہوؤں کی ساس، ڈھیر سارے پوتوں پوتیوں کی دادی کہ سلام دعا لیتے دیتے ہی گیارہ بج گئے۔ مردوں کی عیدگاہ سے واپسی پر عورتوں کی عید ہوتی ہے۔ [illegible] ساس پیڑھی پر بیٹھ نگاہ و دل کو ٹھنڈک پہنچانے لگیں۔

بڑی دلہن نکلیں: ہری بنارسی ساڑی، جگمگاتا جڑاؤ زیور، سنگھار پٹار کیے، مسکراتی جھینپتی، کن انکھیوں سے میاں کو دیکھتی ہوئیں۔ ادھر سے منجھلی دلہن آئیں: کمخواب کا پائجامہ، بنارسی چولی

کرتی، تاش کا دوپٹہ، گھنے پائنچے سے سجی بنی۔ عزیز میاں، ذاکر میاں، اکرم میاں کی دلہنیں ایک دوسرے سے چہلیں کرتیں، ہنستی مسکراتی پھر رہی تھیں۔ پھر بلقیس آئیں: چھیوں بہوؤں میں یہ سب سے زیادہ بھاری تھیں۔ سرخ کامدار تولوں ساڑی پہنے۔ چھ مہینے کا پیٹ اونچا اونچا ابھرا ہوا، مسی کی دھڑی اور مانگ میں افشاں۔ ایسے بھاری زیور کپڑے اوپر سے وہ ایسی نازک بھولی جان! چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ بچے رنگین کپڑوں میں ملبوس، منہ میں پان ٹھونسے تھوکتے پھر رہے تھے۔ کبھی باہر تو کبھی اندر، ابھی یہاں تو ابھی وہاں۔ مردانے میں ملنے والے آئے اور بادل ناخواستہ مرے مرے قدموں سے چھوٹے میاں بھی عید ملنے، معانقہ کرنے گئے۔

ایک دم اندر سے بچوں کا شور اٹھا اور ہاتھوں میں ایک بنڈل سا پکڑے لے کے آئے۔ آٹھ بارہ آنے گز میں ملنے والے سرخ ریشم کی ساڑی اور ایسی ہلکی قسم کی کہ پہننے والی ذرا بھاری کو لپکی ہوئی تو ایک ہی دھوپ میں بکس بکس جائے، اور ایک سرخ ہی رنگ کا بھاری ساڑاک، جس پر جگہ جگہ ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے۔ یہ ایک مجبور شوہر اور ارمان بھرے باپ کا آنسو بھرا تحفہ تھا۔ صبح یوں ہی غالب بی سارے گھروں میں اگربتیاں سلگاتی پھر رہی تھیں کہ انھیں سرخ لچکا جھلکتا ہوا دکھائی دے گیا تو انھوں نے کہاں سوچا تھا کہ یہ عید کی بھاری بناوٹ ہے۔ وہ بڑے غور سے ساڑی کو دیکھنے لگیں۔ ان کی نظر کے سامنے سے بڑی دلہن گزریں۔ جن کی بنارسی ساڑی جھم جھم چمک رہی تھی۔ سو دو سو سے کم کی کیا ہوگی! پھر منجھلی دلہن کی کمخواب کا پاجامہ ہی سوا ڈیڑھ سو کا ہوگا، کرتی، چولی، دوپٹہ تو الگ رہا۔ پھر چھوٹی بہوئیں، جن کے کپڑے ایسے بھاری، کامدار، تولوں کہ چلنے میں لپک لپک جاتی تھیں۔ اور یہ ساتویں شہزادی کیا پہن رہی ہے آج! — غالب بی کا جی اندر سے پگھل اٹھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ چھوٹے میاں کے کمرے میں آئیں اور بنڈل کرسی پر پٹخ، الٹے پیروں واپس نکل گئیں۔

چھوٹے میاں کمرے میں داخل ہوئے، گھڑی پر ایک نظر کی، ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ کرسی پر سے بنڈل اٹھایا۔ ابھی ایک قدم باہر اور ایک اندر ہی تھا کہ غالب بی لپکی ہوئی گئیں —

ہاتھوں میں بڑا سا طشت سنبھالے، جس پر جھالریں لگا ہوا سرخ کپڑا لٹک رہا تھا۔

طشت میز پر رکھ کر انھوں نے چھوٹے میاں کا کندھا پکڑ لیا۔ ان کی آنکھیں یوں پھیل گئی تھیں کہ ان کا جی کٹ گیا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" انھوں نے تن تنا کر پوچھا۔

چھوٹے میاں نے کچھ جواب نہ دیا، سر جھکایا۔

تہ خانہ

خالہ بی نے بنڈل ہاتھ سے جھپٹ لیا، تلخی سے بولیں :- "اور یہ کیا ہے ؟"

"چھوٹے میاں نے کوئی جواب نہ دیا تو ترشی سے بولیں:" عید کا جوڑا ہے نا ۔ ؟"

چھوٹے میاں پھر بھی سر جھکائے کھڑے ہی رہے۔

"کلموہے عید پر کوئی ایسا ہلکا سا جوڑا بنایا کرتا ہے ۔ ؟"

چھوٹے میاں نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا جو غصے غصے بول رہی تھیں۔

"مقبول میاں کی بہو اور یہ بارہ آنے گز والا ریشم ! شرم تو نہیں آئی تجھے اپنی دلہن کو ایسا کپڑا پہناتے ہوئے ؟"

چھوٹے میاں کو کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔

"یہ جوڑے لے جا اور اپنی دلہن کو پہنا کر لے آ ۔ اکیلے میں اُس کا جی گھبراتا ہوگا ۔ یہاں چار میں جی بہلے گا۔" اُنھوں نے سرخ بنڈل کی طرف نفرت سے دیکھا۔

"تجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ہلکی پھلکی کرن یا گوٹ ہی خرید لیا ہوتا کہ ساڑی ساجی تو ہو جاتی ۔" اور اُنھوں نے طشت پر سے طشت پوش ہٹا دیا ۔ چھوٹے میاں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا ۔ یہ وہ پانچ کامدار جوڑے تھے جو اماں نے بڑے چاؤ سے اپنی بہو کے لئے خود اپنے ہاتھوں تیار کئے تھے !!!

فاختہ

مینا ابھی ابھی بستر پر سے اُٹھ کر گئی تھی۔ اس کے بدن کی گرمی سے بستر گویا جھلس رہا تھا۔ سر کے دباؤ سے تکیہ کے بیچ میں ایک گول سا نشان پڑ گیا تھا۔ چوٹی جو پیٹھ کے نیچے دب گئی تھی، اس نے چادر پر اپنا بل کھایا ہوا نقش چھوڑ دیا تھا اور پورا بستر بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

بشیر میاں ہوتے اندر کر بستر پر بیٹھنے لگے تو اک دم انہیں مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ بستر پر بیٹھے تو اُسے بڑا نرم نرم، گرم گرم سا پایا، جیسے فاختہ کے پر۔

"سوں" کر کے اُنھوں نے زور سے سانس لی اور ناک سے ہوتی ہوئی خوشبو ان کے دل تک اتر گئی، اک دم وہ بوکھلا سے گئے۔ یہ کیفیت تو ان پر کبھی نہ گزری تھی۔ ایسا لگا گویا فاختہ کے گدگدے اور تپتے ہوئے پروں میں دھنس گئے ہوں۔ وہ بستر سے اٹھ گئے۔ منی اور ارشد کرے کے باہر کھیل رہے تھے۔ اُنھوں نے بڑی سہمی ہوئی آواز سے پکارا:۔

"اے منی۔ اے ارشد۔ ذرا ادھر تو آؤ۔"

منی بھاگتی ہوئی آئی اور آنکھوں پر سے بال ہٹاتی ہوئی بولی:۔

"ہمیں بلایا ابا میاں؟"

"بیٹی تم میرے بستر پر سوئی تھیں!" اُنھوں نے حد درجہ رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں جی۔ ہم تو جب سے باہر کھیل رہے ہیں۔"

"اچھا تو شاید ارشد سویا ہوگا۔" اور اُنھوں نے ارشد کو پکارا۔ "واہ جی۔ ہم تو اکیساں سی

کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ہم نے تو نئے ہی دھرے میں گدے پیر آپ کے بستر پہ۔ ہاں آپا ابھی ابھی سو کے اٹھی ہیں۔"

شبیر میاں سن ہو گئے۔ "! بستر پر مچلتی ہوئی خوشبو نے انہیں آپ ہی بتا دیا تھا۔ میں مینا کے پاس سے آئی ہوں!"

انہیں یاد آیا، ممانی بی سدا مینا کے لئے چکی میں خوشبودار مصالحے پسوایا کرتی تھیں۔ اور مینا ہمیشہ صابن کی بجائے مصالحوں سے نہاتی ہے۔ تبھی تو اس کے بال اتنے لمبے لمبے ہیں اور چلنے میں اس کے پاس سے نئی نویلی دلہنوں کی سی خوشبو آتی ہے۔

گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر بڑی باریک سی ملائم سی میٹھی آواز آئی۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو میاں آ گئے۔"

آج شبیر میاں کو یہ آواز بالکل نئی لگی، لہجہ بالکل نیا لگا اور وہ بیٹھے بیٹھے الجھتے رہے۔ "اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے" ممانی بی مینا کو کئی بار ٹوک چکی تھیں کہ "اے بیٹا اپنے سے بڑوں کو رشتہ لگایا کرتے ہیں۔" مگر جہاں جہاں بھی رشتہ لگانے کا موقع آیا، مینا کی زبان ہکلا گئی۔

شبیر میاں ممانی بی کے ٹکڑوں میں سے ہوتے تھے۔ ایسا بہت دور کا رشتہ بھی نہ تھا۔ شادی ہوئی تو دہرا رشتہ ہو گیا۔ بھانجے لگتے تھے اور ممانی بی، ممانی بی کہتے کہتے منہ سکھاتے تھے۔ ممانی بی کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ کوئی کار ہو، کوئی کاج، ہر کام میں شبیر میاں کی رائے لی جا رہی ہے، شبیر میاں بلائے جا رہے ہیں۔

جہاں کوئی اچھی چیز بگی رکابیوں میں لگا، سرپوش ڈھک جھٹ سے شبیر وا کے حوالے کشتی کی کہ "جا جلدی سے شبیر میاں کے ہاں پہنچا آ۔"

شبیر میاں بھی ممانی سے ایسے گھلے ملے تھے کہ ماں سے بھی اتنی نہ رہی ہو گی۔ اور جب سے تو ان کی جاگیر کا قصہ ختم ہوا تھا یہ اپنا گاؤں چھوڑ کر یہیں آ بسے تھے۔ ممانی بی کے ہی پڑوس میں چھوٹا سا مکان تھا، وہیں رہتے۔ شادی شدہ تھے، شریف خاندانی بیوی تھی، دو بچے۔ مزے سے کٹ رہی تھی۔ اپنے کام کاج سے فرصت پاتیں تو رشیدہ بیگم بھی گھڑی دو گھڑی کو ممانی کے پاس آ بیٹھتیں۔ مینا سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ دل سے دل ملنے میں کیا دیر لگتی ہے؟ یہ تیس کے اندر تھیں اور مینا تو سولہویں سترہویں ہی میں تھی، پھر بھی دونوں ایسی گھلی ملی تھیں گویا ساتھ کی کھیلی سہیلیاں۔ گھنٹوں سر جوڑے بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔

مینا کو شہر سے افسر کا پیام آیا تو انہی کی کوششوں سے ہی نہ ہوئی تھی۔ اب لاکھ ممانی بی

ناخنہ

کہتی ہیں :۔

" وا ہی ۔ اچھا کماؤ لڑکا ہے، گن کا ڈھنگ کا ۔ اب اور کیا دیکھیں گے؟" مگر رفیعہ بیگم کی ایک نہیں تو لاکھ نہیں۔ ممانی بی نے کہا بھی :۔

" تم ایسی جنم جنم کی دشمن کاہے سے ہو گئی ہو، لڑکی کی کہ منہ توڑ انکار کئے جاتی ہو۔"

ہنس کے بولیں۔ " اے ممانی بی! ہماری مرضی نہیں تو آپ کیوں بجھد کر رہی ہیں۔"

اصل میں مینا کی مرضی نہ تھی۔ کیوں نہیں تھی؟ بس نہیں تھی ؟ اڑتے اڑتے اتنا ضرور سنا تھا کہ صاحبزادے ذرا رنگین مزاج ہیں۔ ممانی بی اتنی روشن خیال بھی نہ تھیں کہ بیٹی کے منہ سے صاف نہیں، سن سکتیں، اس لئے رضیہ بیگم نے اپنی طرف سے توڑ جوڑ کر کے بات بنا دی۔ ممانی بی بھی کھٹک گئیں۔ سوچا ۔ " اپنی طرف سے تو یہ زور زبردستی سے کر نہیں سکتی، ہو گی دونوں کی ملی بھگت۔" خاموش رہ گئیں۔

ویسے سچ بات تو یہ تھی کہ ممانی بی اتنی لکیر کی فقیر بھی نہ تھیں۔ انہوں نے تو آپ ہی بہت سی دیواریں گرا دی تھیں۔ " عصمت " تو خیر بہت زمانے سے آتا تھا۔ اب تو رسالوں کی ڈور بندھ گئی تھی۔ جہاں کسی نئے پرچے کا نام سنا اور مینا نے چندہ بھیجا۔ اتنا یقین تو انہیں بیٹی پر ضرور تھا اوندھی سیدھی کتابیں تو خیر مینا نے نہیں پڑھیں۔ مگر یہ انہونی ضرور کر دکھائی کہ لے کے ایک مضمون ضرور لکھ ڈالا۔ اب نصیب ہی اوندھے ہوں تو کوئی کیا کرے؟ وہ چھپ بھی گیا۔ سارے خاندان میں وہ لے دے ہوئی کہ ممانی بی سے تو منہ چھپانا بھی تو نہ بن سکا۔ پانی ایک ہی بار بند توڑ کے راہ بنالے تو پھر تو ہر جگہ سے بہتا چلا جاتا ہے۔ پہلی بات تھی، سبھوں میں دھوم سی ہو گئی مگر اب بعد میں تو یہ عالم ہو گیا کہ مینا نے باقاعدہ انگریزی بھی پڑھ ڈالی۔ بہشتی زیور اور دینی مسائل تو پڑھے ہی پڑھے تھے، الٹے سیدھے ناول، کہانیاں بھی پڑھنی شروع کر دیں۔ سب سے پہلے جو کتاب گھر میں آئی " دولت پر قربانیاں " تھی۔ پھر تو گویا کھل جھٹی ہی مل گئی۔

مگر اب الٹے سیدھے ناول پڑھنے کا یہ بھی مطلب نہیں ہے، سرے سے ناک کاٹ ڈالی ماں باپ کی۔ مگر ہاں اپنا مستقبل ضرور بنا لیا۔ ساتھ ہی ساتھ پرانی باتوں کا توڑ بھی اسی نے توڑا۔ چار کلی کے کمرے پائنچوں کے پاجاموں اور بند گلے کی کرتیوں کی بجائے وہ ساڑی پہنتی تھی۔ کانوں میں ممانی بی کے جہیز کی بالیاں تو اس نے سرے سے پہنیں ہی نہیں۔ جگمگ جگمگ کرتے ٹالیس پہنتی تھی، جھکا جھول چندن ہار اور چوسری کی بجائے گلے میں ہلکا پھلکا نکلس ڈال لیتی۔ اور یہ بھی روز روز نہیں۔ کسی کے ہاں آنا جانا ہوا تو ملا کے اصرار پر پہن لیا، نہیں تو وہی اپنے بونڈے ہاتھ، بونڈا گلا، آتے جاتے والیاں ٹوکتیں بھی :۔

"اے کنواری اور سہاگن سے ہی گھر کی رونق ہے۔ یہ ٹھونٹھے ہاتھوں کی کیا جال اٹھائی ہے بی" یہ مسکرا کر رہ جاتی۔ خاندان والے تو علی الاعلان کہتے کہ" اے بی بڑی بیگم نے تو لونڈیا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے"۔

گھپ اندھیرے میں زور دار اجالا گھس پڑے تو آنکھیں پہلے تو پچ پچ کرنے لگتی ہیں اور پھر اسی چکا چوند اجالے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ مانی بی کو تو احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ واقعی ان کی بیٹی اور خاندان والیوں سے الگ ہے۔

مانی بی کے میکے میں، اور اب یہاں سسرال میں بھی اتنا سخت پردہ تھا کہ مردوں کی تصویر تک دیکھنا گویا پردہ توڑ دینے کے برابر تھا۔ مینا کو بھی حسب قاعدہ سب سے پردہ کرایا جاتا۔ مگر اس نے جو ادھر ہاتھ پاؤں اچھالے تو سبھی جڑیں کاٹ پھینکیں۔

رضیہ بیگم کا زچہ خانہ ہونے والا تھا۔ دردوں سے بے حال پڑی تھیں، ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر کا تو کدھر گزر ہوتا، محلے کی دائی کو بلایا گیا۔ وہ بھی آخر کو اناڑی نکلی۔ کچھ سمجھ پڑا، کچھ نہ پڑا۔ اس نے اناڑی ٹیڑھے ہاتھوں سے بچی زچہ کو ایسے جھونٹے دیے کہ الٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔

بڑی تجربہ کار بوڑھیاں بھی ہاتھ مل کر رہ گئیں۔ مانی بی کو بھی کچھ نہ سوجھا۔ مینا اپنے گھر ہی پر تھی۔ کنواری بالی چھوکریوں کا ایسے موقعوں پر کام ہی کیا! مگر شبیر میاں کو تو معلوم تھا کہ بٹیا کافی لکھ پڑھ گئی ہیں۔ چھنو خالہ کا بیٹا حوض میں گر پڑا تھا تو انہوں نے اوندھا لٹا کر سارا پانی نکلوایا تھا۔ ممتو ماں کو سانپ نے کاٹا تو یہ اثر زائل ہونے تک نیم کی پتیاں بار بار چبواتی رہیں۔ ممکن ہے رضیہ بیگم کو بھی کوئی دوا لگ جائے۔ اے مان لیا کہ ڈاکٹرنی نہیں تھیں، پھر بھی تھوڑی بہت دوا دارو دینی آتی ہی تھی۔

دوڑے دوڑے آئے۔ وہیں پردے کے پاس کھڑے نصیبن بوا سے کہلوایا:۔

"چھوٹی بی بی سے کہیو بیوی کی طبیعت اچھی نہیں" ساری بات پوری ہونے سے پہلے ہی نصیبن بوا تڑخ اٹھی، "اے میاں تمہاری عقل سلامت ہے؟ بالی چھوکری..... یہ بات پوری ہونے سے پہلے ہی مینا خود دروازے تک پہنچ گئی اور وہیں سے بولی:

"میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیجیے" اور ایک ڈاکٹرنی کا پتہ بھی بتا دیا۔

شبیر میاں الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ جانے کیا بات یاد آئی تو پھر لوٹ کر آئے، آواز دی اور کہا:۔

"میں تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ فیس کیا لے گی!" ابھی یہ بات منہ میں ہی تھی کہ پھر بولے "اور فیس کا کیا ہے! جان سے بڑھ کر تو پیسہ نہیں ہوتا۔ اللہ جانے وہ آتی ہے یا نہیں؟ پھر میں کیا کروں گا؟"

اور ان کی آواز بھرا گئی۔ واقعہ آدمی جتنا کرے گر بیوی کا ساتھ کچھ ایسا کچا بندھن تو ہوتا نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بیوی ان کا کتنا ذرا کم مانتیں اور بات پیچھے منہ کو منہ دیے چلی جاتیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بیوی منہ چڑھے اُٹھاتا ہے اور بیوی منہ چڑھ میں بٹھاتا ہے، مگر اب یہ بات بھی دیکھی کہ اتنی اتنی سی باتوں کو لے کر وہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے کہ "جاؤ بی بی میں نے تین بار تمہیں طلاق دی۔"

میاں بیوی کی زندگی بچوں کا کھیل تو ہوتی نہیں کہ جب دل بھر گیا ایک نے سب کو مخاطب کر کے کہہ دیا: "کھیل ختم پیسہ ہضم۔" ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ جنبیر دھویں کے کڑی چلے۔

مینا کو بھی خیال آ گیا کہ اللہ جانے وہ انکار ہی کر دے۔ پھر کیا ہو گا؟ لپک کر باہر ہی تو نکل آئی اور بولی۔

"چلیے دونوں مل کر اُسے بلائیں۔" اور اسی جھپاکے میں وہ شبیر میاں کے ساتھ ہو گئی۔

شبیر میاں کی بی بی کی زچگی بھی گئی، چلّہ بھی نہا لیا، بات پرانی پڑ گئی، مگر خاندان والوں نے کیا کیا بہتان نہیں باندھے؟ لیکن مینا نے ذرا شکن نہ چڑھائی۔ خالی بی نے البتہ دو چار دن مینا سے بول چال ضرور بند کر رکھی۔ مگر پیٹ کی اولاد سے کوئی منہ پھیرے بھی تو کب تک؟ اب تو شبیر میاں کا آنا جانا بھی شروع تھا اور مینا بھی سامنے آتی تھی۔ سلام کرنے کو ہاتھ اُٹھاتی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ بس چاندی کا پنجہ چاند ایسے مکھڑے سے چھو جاتا۔ خالی بی ہنس کر پیار سے ڈانٹیں بھی:

"پڑھ لکھ کر بالکل چلن بدل دیا۔ یہ بھی کوئی سلام ہوا؟" مینا ہنس پڑتی۔

رقیہ بیگم کی زچگی بڑی مشکلوں سے ہوا کرتی۔ پہلا بچہ تو جیسا ہوا، ہوا۔ دوسرا اپنے وقت کا مُہر تھا۔ ڈاکٹرنی صاف کہہ گئی تھی کہ اب کے بچہ ہوا تو جان کا خطرہ ہے۔ مگر سال دو برس پیچھے پھر رقیہ بیگم امید سے رہیں۔ اور اب کے جو زچگی کا وقت آیا تو بچہ بھی ضائع ہوا اور ماں بھی۔ شبیر میاں بھری پُری دنیا میں تنہا رہ گئے۔

چہلم پر خالی بی نے بہت آنسو بہائے۔ دل تو شبیر میاں کے لیے بہت ہڑک۔ باتھا پھر کرتی بھی کیا بیچاری؟ جوان بیٹی کا ساتھ تھا اور ہر ایک کے پیچھے شیطان لگا ہے، دنیا دکھاوے کو منہ سے کہا بھی کہ "میاں اب تو دیکھ بھال والا کوئی نہیں۔ ہمارے یہیں اُٹھ آؤ نا۔" مگر شبیر میاں بھی ان کی مجبوری کو سمجھتے تھے، سر ہلا کر انکار کر دیا۔

مینا کو اس پر بڑا ترس آتا۔ بیچارے اول ہی تو اللہ میاں کی گائے تھے۔ اب تو بالکل ہی موم ہو کر رہ گئے تھے، دونوں بچے الگ ڈھائیں ڈھائیں پھرتے، مینا ہاتھ پکڑ کر منہ ہاتھ دھلا دیتی، ناشتے کے وقت آتے تو ساتھ بٹھا لیتی۔

ایک دن شبیر میاں بھی آئے بیٹھے تھے۔ دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ ممانی بی نے پھر پھیر سے ذکر چھیڑا: "لے میاں لوگ تو کہتے ہیں بیوی کی موت کہنی کی چوٹ ہوتی ہے۔ لگتی بڑے زور سے ہے مگر ذرا دیر میں درد غائب۔ تم کب تک یوں ہی رہو گے؟ ماشاء اللہ خود بھی جوان ہو، ننھے ننھے بچے ہیں، کوئی بھی تو ہو دیکھ بھال کرنے والا۔"

شبیر میاں بولے: "ممانی بی رنج و غم کی بات تو جانے دیجیئے، میں سوچتا ہوں آنے والی بچوں سے سگی ماں سا برتاؤ نہیں کر سکے گی، اور میں یہ سب برداشت نہیں کر سکوں گا۔" اُن کی آواز بھیگ سی گئی۔ پھر ٹھہر کر بولے: "کیا گھر کا گھر دا ہو گیا ممانی بی۔ اب تو دھول اُڑتی ہے ہر طرف۔ باہر سے آؤں تو کوئی منہ دُھلانے والا نہیں۔ پانی دانی کی ضرورت پڑے تو خود اُٹھ کر لوں تو لوں، ورنہ کوئی اس کا بھی روا دار نہیں، پیاس ہی بجھا دے۔ بچے الگ تباہ حال۔"

مینا کا دل اندر سے پگھل اُٹھا، بولی:

"آپ ہمارے یہاں آ جائیے نا۔ یہاں اماں بھی ہیں، بچوں کا جی بھی بہل جائے گا۔"

"میں آ تو جاؤں، مگر..... ،" شبیر میاں کی زبان گنگ ہو گئی۔ ممانی بھی بات کا رخ دیکھ کر خاموش رہ گئیں۔ مینا پھر بولی: "خاندان والوں سے ہی ڈر رہے ہیں نا آپ؟ اپنے کام سے کام رکھئے۔ کتوں کا کام بھونکنا ہے، بھونکتے ہی رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر یوں ہی ہاں ہاں ہوتی رہی، پھر ممانی بی نے بھی زور دیا تو شبیر میاں اُسی دن اُٹھ آئے۔ مینا کا وقت اب بڑا اچھا کٹ رہا تھا۔ تمام دن بچوں میں الجھی رہتی۔ بچے بھی ہل مل گئے تھے۔ اپنی ماں کو بھول کر بھی یاد نہ کرتے۔ کبھی کبھار ایسے ہی مینا کے جسم پر کوئی خوبصورت سا کپڑا یا زیور دیکھ لیتے تو کہتے:

"امی جی بھی ایسا ہی کرتا پہنتی تھیں۔"

"ہماری امی کے پاس بھی ایسا ہی ہار تھا۔"

شبیر میاں گھر میں رہتے ضرور، مگر یوں، جیسے۔ ہے ہی نہ ہوں۔ نہ چیٹ نہ پٹ۔ کبھی اونچی آواز سے بولتے، نہ قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ممانی بی جس ڈر سے انہیں اپنے گھر لانے سے ڈرتی تھیں وہ بالکل ناممکن سی بات تھی۔ ایسے بھولے بھالے تھے کہ بھولے سے بھی مینا کو آنکھ بھر کر نہ دیکھتے۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں ممانی بی بولی تھیں: "بچپن میں میری بٹیا مینا کی طرح چہکتی تھی، بس میں

نے یہی نام ڈال دیا۔" اس پر شبیر میاں نے آنکھیں اٹھا کر ضرور دیکھا اور بڑی سادگی سے بولے:

"واقعی اچھا نام دیا آپ نے۔ مینا بڑی پیاری ہنسی ہنستی ہیں۔"

مینا کے چم چم چمکتے دانت گلابی گلابی ہونٹوں میں چھپ گئے۔ اتنی سادگی سے جو اتنا بڑا سچ کہہ دے تو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ شبیر میاں کے لہجے میں کوئی گہرائی نہ تھی۔

بڑے نانا کہتے تھے کتوں کا رونا بڑا نحس ہوتا ہے۔ کتے کے رونے کی آواز آئے تو صدقہ دلوا دینا چاہیئے۔ اس رات رہ رہ کے کتے بھونکتے رہے۔ اور صبح ہی صبح نصیبن بوا نے تازہ تازہ دودھ ابالنے کے لئے چولہے پر چڑھایا تو آپ ہی آپ پھٹ گیا۔ نصیبن بوا زمانہ دیکھے ہوئے تھیں۔ منہ سے کچھ نہ بولیں، مگر مولا کی دہائی مانگنے لگیں۔ چار دن کی بیماری میں مامی بی جھٹ پٹ ہو گئیں۔ اور مینا! مینا سے اکیلی ہو گئی۔ اندھیاروں میں چھپتی روتی پھرتی۔ بستر پہ اوندھے منہ پڑی پڑی سسکیاں لیتی رہتی۔ جیسوں ہی تو پیام اچھے برے آئیں ہوں گے، مگر ماں کو پسند نہ آئے۔ اور جو ماں کو پسند آیا، بیٹی کو ناپسند ہوا۔ بیٹی کے بیاہ کا ارمان جی کے جی ہی میں لے گئیں۔ اب تو خاندان والوں کو موقع ہی مل گیا۔ جہاں دیکھو وہاں مینا اور شبیر میاں موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اونچی سیدھی، جھوٹی سچی، ہزاروں ہی باتیں اڑائی گئیں اور مینا بول چول جاتی۔ باپ کا سایہ تو مدت ہوئی اٹھ چکا تھا، ماں چھاؤں بن کر سہارے جیسی تھیں، وہ بھی چل دیں۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی، مگر روپے پیسے ہی سے سب کام تو نہیں چلتے!

بولنے والے بھی کہاں تک بولتے۔ تھک ہار کر خود ہی چپ رہ گئے۔ شبیر میاں اب بھی مینا کے یہاں ہی رہتے۔ باہر سے آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں پہنچ جاتے۔ گرمی کے دن ہوتے تو دالان میں نظر آتے۔ مونڈھا بچھا ہوا، اخبار منہ سے لگا ہوا۔ سردیوں اور بارشوں میں تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ ان کے آتے ہی گول پیچ دار زینے پر ماؤس سی کھٹ کھٹ سی ابھرتی، اور پھر نرم نرم سی میٹھی آواز:

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔"

شبیر میاں اور مینا اسی زندگی کے عادی ہو گئے۔ نہ ان کے دل میں ان کے لئے کوئی جگہ بنی، نہ انھوں نے ان کو اپنے دل پر چڑھایا۔

ایک دن ارشد اپنی آنکھیں کھجلاتا ہوا آیا اور ٹھنک کر بولا: "ہماری آنکھوں میں کھجلی ہوتی تھی تو امی کاجل لگا دیتی تھیں۔"

"ارے رے" مینا نے اسے پیار سے گود میں اٹھا لیا۔ "تو بھی مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں نہ بنا دیتی اپنے راجہ گڈے کے لئے کاجل؟"

مینا نے سکوری بھر کے وہ تھوڑا سا تیل شیشی سے انڈیلا۔ روئی کو بل دے کر بتی بنائی اور کونے میں چراغ سا بنا کر اوپر سے مٹی کا ایک پیالہ اوندھا دیا گھنٹہ بھر کے بعد یہ اچھا بڑا سا کاجل جم گیا۔ مینا نے ذرا سا پیالے میں کاجل پکڑا اور منے کو گود میں بٹھا کر اس کی آنکھوں میں سلائی پھیرنی چاہی۔

"اں ہاں۔ امی کہتی تھیں آنکھوں میں دو ہاتھیں پھیرنا چاہئے۔" مینا ہنس پڑی۔

"اچھا تو انگلی سے لگا دیں!"

"ہاں" ارشد نے سر ہلایا۔

مینا نے ارشد کی دونوں آنکھوں میں انگلی پھیری۔ تھوڑا کاجل پھر بھی انگلی پر لگا رہ گیا۔ وہ اس نے اپنی آنکھوں میں بھر لیا اور بھول بھی گئی کہ کاجل لگایا تھا۔

شام کو شبیر میاں آئے۔ گول چبوترہ زینے پر مانوس قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ پھر میٹھے لہجے میں آواز آئی:۔

"اے خانساں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔"

دسترخوان پر بیٹھے تھے کہ ارشد مینا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے آیا۔

"ابا میاں آپا نے آنکھوں میں کاجل لگا دیا ہے۔ دیکھا آپ نے؟"

"ہاں۔ ہاں بڑی اچھی ہیں تمہاری آپا" اور وہ اسی انہماک سے کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد دالان میں تخت کے کونے پر بیٹھے تھے کہ مینا آگئی۔ اخبار دیتے ہوئے بولی:۔

"ذرا پڑھنے کے لئے لے گئی تھی۔ معاف کیجئے بغیر پوچھے ہی اٹھا لیا۔" شبیر میاں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی معذرت پر کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر ایک دم رک کر سادگی سے بولے:۔

"ارے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ مینا تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔" اور اخبار لے کر یوں پڑھنے میں منہمک ہو گئے گویا کسی لڑکی کی خوبصورت آنکھوں کی تعریف نہ کی ہو، موسم کی تعریف کی ہو۔

"واہ بھئی۔ کیا اچھا موسم ہے!"

مینا جو گھبرا کر الٹے پاؤں بھاگی، اس کا پیر ساڑی سے الجھ گیا اور وہ گر پڑی۔ شبیر میاں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ نرم نرم، گرم گرم پروں والی فاختہ گویا ہاتھوں میں آگئی۔ سادگی سے بولے:۔

"ذرا سنبھل کر چلیں، ابھی ہڈی چورا ہو گئی ہوتی!" اور اٹھاتے میں مینا کا سر ان کی ناک سے اتنی قریب ہو گیا کہ بھینی بھینی سی خوشبو سے ان کا پورا وجود مہک سا گیا۔

شبیر میاں نے اس دن اخبار پڑھا ضرور، لیکن کوئی اگر پوچھتا:۔ "سنائیے میاں آج کی خاص خبر کیا ہے؟" تو وہ سٹپٹا کے رہ جاتے۔

فاختہ

مینا تین دن سے کھانسی نزلے میں پڑی گھل رہی تھی۔ شبیر میاں کو تین دن سے وہ مانوس کھٹ کھٹ سنائی نہ دی تھی۔ اُنھوں نے چاہا خبر لینے کو جائیں، مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ جانے کا ارادہ کرتے تو لگتا کہ نرم نرم پروں کے ڈھیر میں دھنسے جا رہے ہیں۔ گھبرا کر وہ باہر نکل آئے۔

"اونہہ! زکام بھی کوئی بیماری ہوئی بھلا۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

ایک دفعہ وہ بخار میں بھن کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے تو مینا نے اُنھیں مشورہ دیا تھا:۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو ہونا چاہیے!"

اب اُنھیں خیال آیا، یہ مینا شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیے نا!"

پھر اُنھیں مینا اور ممانی بی کے احسان یاد آ گئے۔ اُنھوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ مینا کے لائق بر ڈھونڈھ نکالیں گے۔ مینا جو اتنی پیاری، اتنی خوبصورت، اتنی سگھڑ، اتنی تعلیم یافتہ ہے، اس کے جوڑ کو جوڑ تو ملے۔ مینا کا دل کتنا نرم تھا۔ کئی بار وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ چکے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے کرتے وہ رفیعہ بیگم کی یاد میں آنسو بہانا شروع کر دیتی۔ بچوں سے اتنی ہل مل گئی تھی کہ رفیعہ بیگم کی کمی بھلا دی۔ بچے اب صاف ستھرے رہتے۔ روتے بسورتے نہ تھے اور صورت پر پیار آ گئی تھی۔

"لاحول ولا،" شبیر میاں نے سوچا، "میں بھی کتنا کور اخلاق ہوں کہ وہ تو مجھ سے، میرے بچوں سے اتنی ہمدردی کرے اور میں اس کی خبر تک نہ لوں۔" اخبار مونڈھے پر رکھ کر اُٹھے اور مینا کے کمرے کی طرف چلے۔

مینا نے سردی کے مارے سوئیٹر چڑھا لیا تھا۔ اب تو گرمی ہوئی تو اُسے اُتار پھینکنا چاہا۔ سوئیٹر کھلے گلے کا نہ تھا، گردن میں سے اُتارنا چڑھانا پڑتا۔ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے ساڑی کا آنچل دونوں گھٹنوں میں دبا کر وہ پیٹھ کے بل جھکے جھکے زور لگا کر سوئیٹر اتار رہی تھی۔

شبیر میاں روایتی کانچ کی جوتی اور بالوں کی سنہری لٹ دیکھ کر اندھا دھند عاشق ہو جانے والے شہزادوں میں سے تو تھے نہیں، مگر میاں ایک جگمگاتی صبح دیکھ کر گھبرا اُٹھے۔ ڈھیر سارے نرم نرم پروں میں ان کا اپنا وجود ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر لوٹ گئے۔

مینا نے قدموں کی چاپ سن کر بمشکل سوئیٹر کھینچ کر پھینکا اور دیکھا تو شبیر میاں سر نیہوڑے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے۔

تین دن سے تو بخار ہی تھا۔ تین دن مینا نے یوں ہی کمرے میں کاٹ دیئے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ باہر نکلے۔ ساتویں دن اپنے کمرے سے باہر آئی تو سہی، مگر شبیر میاں سے یوں بچائی بچائی جیسے نئی نویلی دلہن سسرال دکھاوے کو دولہا سے شرمائے اور موقع ملنے پر رہ رہ کے کن انکھیوں سے دولہا کو دیکھتی جائے۔

شبیر میاں چپ چپ سے تھے۔ آج بھی انھیں یہ خوشبو اپنے تکیے پہ، بستر پہ مل رہی تھی، جو اپنے منہ سے کہتی تھی:۔

"میں مینا کے پاس سے آئی ہوں۔"

اب مینا اتنی گری گزری بھی تھی کہ کس کے بستر پر لوٹیں لگاتی پھرے۔ منی اور ارشد سونے کے لئے کمرے میں جاتے تو اُسے بھی گھسیٹ لیتے۔

"آپا ہمیں ڈر لگتا ہے نا۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے۔"

تب تک وہ سوئیں سوئیں، پہ بیٹھی کتابیں ٹٹولتی رہتی۔ کبھی کبھار پیٹھ سیدھی کرنے کو شبیر میاں کے بستر پر ڈھلک جاتی۔ انہیں کا پلنگ اس وقت خالی ہوتا تھا۔

بدلی چھائی، برس گئی۔ آسمان پھر نیلا نیلا، دھلا دھلا تھا۔ وہی شام کی واپسی، وہی بچوں کی شرارت، وہی مینا کی کھنکتی ہوئی ہنسی اور گول پیچ دار زینے پر اس کی کھٹ کھٹ کے بعد نرم، ملائم گھل گھل سی آواز:۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو، بچے آ گئے۔"

جاتے جاتے ایک دن شبیر میاں کہہ گئے:۔

"مینا ان کپڑوں کو ذرا دھوپ دکھا دینا، کپڑا نہ لگ جائے۔"

اس دن تو مینا سے نہ ہو سکا۔ دوسرے دن صبح ابھی شبیر میاں گھر ہی پر تھے تو سارا سامان لے کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں کے صندوق میں زیورات کی صندوقچی بھی تھی۔ بچے بھی آ گئے۔ صندوقچی کھول کے یوں ہی مینا بیٹھ گئی۔ سامان الٹ پلٹ کرنے لگی۔ صندوقچی بھری پڑی تھی۔ زیور سے لے کر آنچل تک، بس جوں کی توں۔ بچے پاس بیٹھے اوندھی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بھی سوال انہوں نے اپنی ماں کے متعلق نہ کیا۔

مینا خود ہی بول اُٹھی:۔

"امی کی یاد آتی ہے تمہیں؟" ارشد اور منی ایک زبان ہو کر بولے:۔

"اوں ہوں۔ آپ جو آتی اچھی ہیں!"

"مگر میں امی کی برابری کہاں کر سکتی ہوں۔" وہ ہنس کر بولی۔ "اوں ہوں" ارشد بولا، "ہم تو آپ کو اپنی امی سمجھتے ہیں!" مینا کا منہ لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپ اُٹھے۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے گیلے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے مسکرا کر بولی:۔ "سچ؟"

"ہاں اور کیا!" ارشد بولا

مینا نے صندوقچی کا نچلا خانہ ٹٹولا۔ کالی پوت کا گچھا پڑا چمک رہا تھا۔ اس نے اسے اُٹھا کر

مٹھی میں دبا لیا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ روز اسی وقت شبیر میاں گھر سے باہر جاتے تھے۔

وہ تیزی سے لپکی۔ زینے کے پاس تھوڑی دیر رکی۔ مٹھی کھولی اور پھر دوڑتی ہوئی دالانے میں رک گئی۔ "سنیے —" وہ ٹھٹھک گئی۔

شبیر میاں بھی رک گئے اور اک دم چونک گئے۔ دھانی ساڑی میں اس کا ہلکا پھلکا جسم کانپا جا رہا تھا۔ ساڑی کے آنچل کا ایک کونہ پتلے پتلے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ پلکیں لرز رہی تھیں اور گوری گوری گردن میں سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ کالی پوت کا لچھا کانپ رہا تھا۔

وہ اٹک اٹک کر بولی :-

"سنگھار دان میں اور تو سب چیزیں ہیں۔ گر مسی نہیں ہے!" اور وہ منہ پلو میں چھپا کر نہ مار کر بھاگ گئی۔ شبیر میاں کے آس پاس نرم نرم فاختئی پروں کا ڈھیر سا لگ گیا اور وہ ڈوبتے ہی چلے گئے۔

"شام کو جب وہ ہاتھ میں مسی کی دہری پو[illegible] سنبھالے گھر میں داخل ہوئے تو گول پیچ دار زینے پر مانوس سی گھٹی گھٹی ہوئی اور نرم ملائم سی، شکر میں گھلی ہوئی میٹھی آواز گونجی :-

"اے خانساماں کھانا لگا دے۔ "وہ" آ گئے ہیں!"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘

www.taeneernews.com

سہاگن

سلیمان میاں تو سدا کے گڑ لاڈلے تھے۔ اس میں ان کا اتنا اپنا قصور بھی نہ تھا جتنا کہ ماں باپ کا۔ اور باپ سے بڑھ کر ماں۔

اکلوتی اولاد تھے۔ جو بولتے ماں پورا کر دکھاتیں۔ جوانی آئی مگر ان کے چلن میں کوئی فرق نہ آیا۔ بس وہی کریں گے جو دل میں سمائے گی۔ ماں باپ نے چھوٹ ہی ایسی دے رکھی تھی ـــــ

بھری برسات کے دن، نالے میں پانی اچھل اچھل کر کتھئی رنگ کا ہو گیا۔ بھراٹے دار ہوا اور چڑھانے کا بہاؤ۔ ایسے میں بھلا کوئی پیدل تیرنے کو جایا کرتا ہے۔

باہر نکلنے لگے تو ماں نے پوچھا بھی "کہاں جانے ہو سلو میاں ــ؟"

بولے: "ایسے ہی ذرا گھوم کر آتا ہوں اماں ــ"

"دوئی ایسے میں کہاں گھومنا ہے میاں ــ؟ سارے مینہ پچھاہٹ ہو رہی ہے۔ ایسے میں گھر میں بیٹھتے ہیں یا سیر سپاٹے کو جاتے ہیں ــ؟"

اب تو چاہتی ہیں میں لڑکیوں کی طرح گھر ہی میں بیٹھا رہا کروں بھلا اس ــ موسم میں کا جو مزہ ہے وہ پھر کہاں ــ؟" دھڑاک سے دروازہ کھول باہر نکل گئے۔

تہ خانہ

صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے سہ پہر، سہ پہر سے شام اور پھر کالی گھور اندھیری رات۔

رات کے سناٹے میں ٹہلنے والے سلیمان کی لاش مچھلیوں کے گھر پہنچ گئی۔۔ "ہائے میرا لال!" حمیدہ بیگم دھاڑیں۔ اندھیرے کو ٹٹولتی ہوئی ماں دروازے تک آئی تو دیکھا کھری چارپائی پر دھلی دھلائی لاش رکھی ہے۔ اور کچھ ان سے دیکھا نہ جا سکا، دھڑ سے چوکھٹ پر گر پڑیں۔

اختر بھائی کے بچے کو گود میں لئے دودھ روٹی کا چورا کھلا رہی تھیں۔ "راجہ کیا کھائے گا۔۔؟"

"ہپّا۔۔" منّا منہ پھاڑ کر بولا

"راجہ کیا پئے گا۔۔!"

"ممّا۔۔"

"اور راجہ دولہا کیسے بنے گا بھئی۔۔!"

"ڈم۔۔ ڈم۔۔ ڈھما۔۔" منّا دونوں ہاتھوں سے ہو بہو کے تالیاں پیٹنے لگا اور اختر زور زور سے ہنسنے لگی۔

اک دم باہر سے عزیز میاں بھاگے ہوئے آئے۔ اُن کے ہاتھوں میں مسلا مسلا یا پوسٹ کارڈ تھا اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اختر کو یوں بے تحاشا ہنستا دیکھ کر اُن کا منہ کھنچ گیا۔ اپنی ساری طاقت سمٹ کر وہ بڑی مشکل سے پکارے:

"اجی کہاں ہو؟ سنتی ہو!"

وہ بوکھلائے بوکھلائے اختر کی ماں کو آوازیں دینے لگے

"جی۔۔" عارفہ بیگم کھلا سر ڈھانپتے ہوئے، ذرا مسکراتے ہوئے باورچی خانے سے نکل آئیں۔

"ذرا ادھر سے گزر رہی تھی، ماما تو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ توبہ میری آپ بھی یوں چلّانے لگتے ہیں کہ آدمی بدحواس ہو جائے موا۔" اک دم ان کے ہاتھ کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"کس کا کارڈ آیا ہے۔۔؟"

عزیز میاں کہیں بہت دور سے بولے "سلیمان میاں کہیں تیرنے گئے تھے۔"

اختر کے کان کھڑے ہو گئے۔ عارفہ بیگم کا منہ ذرا سا اُتر گیا۔ میاں جو رک گئے تو بیتابی سے بولیں،

"ہاں ہاں تو کیا ہوا پھر۔۔؟"

"آدھی رات کو ان کی لاش گھر لائی گئی۔"

سہاگن

"واثق۔؟" عارفہ بیگم نے سوئے ہوئے انداز میں کہا۔ "واثق۔؟" سفید آنچل ان کے سر پہ پھڑ پھڑ کرنے لگا۔ اختر کے ہاتھوں سے دودھ روٹی کا نوالہ چھوٹ کر رکابی میں جا گرا۔ ایک دم عارفہ بیگم دوڑیں اور اختر سے لپٹ کر بَین کرنے لگیں:۔

"ہائے میری بیٹی! ہائے میری دلاری! ابھی تیرے سہرے کے پھول کھلے بھی نہ تھے کہ بیوہ ہو گئی ہائے!"

ماں کے آنسوؤں سے اختر کا منہ دھل رہا تھا اور وہ سہم کر ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔ چند لمحوں میں وہ اس قدر بوڑھی ہو گئیں تھیں!

ستّو میاں خود تو قبر کی گود میں جا سوئے اور اختر کے نصیبوں کو روگ لگا گئے۔ اختر گیارہویں سال میں تھی۔ زمانہ ہوا ستّو میاں سے نسبت طے پا چکی تھی اور اب تو شادی کی تاریخ مقرر ہونے کی گڑبڑ مچ رہی تھی۔ چھوٹی سی دھان پان سی گڑیا۔ یوں تو گیارہ برس پورے ہونے کو آرہے تھے مگر ذرا بھی سمجھ نہ تھی۔ ساس کی یہی خوشی تھی کہ گڑیا ایسی بہو گھر میں چھم چھم چلے، ادھر ماں کہتی تھیں:۔ "کچھ نہیں تو بیٹا کو ہرا دوپٹہ تو اڑھا دوں۔"

اب لاکھ ننھی تھیں بی اختر، مگر یہ تو سمجھتی ہی کہ ان کی نسبت ٹھہر چکی ہے۔ خالہ کے بیٹے ستّو میاں کبھی چھوٹی خالہ سے عید بقرعید ملنے آتے تو اماں پکارتیں:۔

"دوئی لڑکی شرم ہے یا نہیں۔؟ اندر جا کر بیٹھ۔ کیا ہونے والے مرد سے دیدے لڑائے گی؟"

اندر جا کر بیٹھ تو جاتیں، مگر دروازے کی جھری سے آنکھ لگ جاتی۔ "کالی ٹوپی، کاسنی رنگ کی اچکن، چست پاجامہ۔ ہائے کیا پیارے شہزادے سے لگ رہے ہیں۔ میں مر جاؤں! اماں نے ان کی پیشانی پہ کیسے چٹ سے بوسہ لے لیا۔ لو وہ بیٹھ بھی گئے۔ جانے وہ کیوں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہے ہیں۔ اب ایسی بھی کیا شرم! ابھی اماں اتنے چاؤ سے سیویاں کھلا رہی ہیں تو کھا کیوں نہیں لیتے۔؟"

"اور تو سب گھر میں خیریت ہے خالہ بی۔؟" وہ بڑی شرما شرمی سے پوچھ ہی لیتے۔

خالہ بی کے چہرے پہ ہنسی کی لہر سی آتی مگر وہ سنجیدہ ہو جاتیں۔ "ہاں اللہ کا فضل ہے۔"

"اے لو، کیسی مطلب کی بات کرتے ہیں۔ اب بھائی دلہن سامنے بیٹھی ہیں، سنا ہے اچھل بجا رہا ہے، بھیا ساتھ بیٹھے سیٹوں میں حقہ لگا رہے ہیں، ابا تو ہوں گے ہی بیٹھک میں۔ پھر آپ کس کی خیریت پوچھتے ہیں۔؟ بھئی یہ، واہ ذرا سی شرم بھی تو نہیں آتی!"

بھائی دلہن جان پوچھ کر اندر آجاتیں اور نند ہونے کے ناطے مذاق کرنے سے کبھی نہ چوکتیں۔

"اے بی یہ جھری سے لگ کر کیوں بیٹھی ہو بوا؟"

"ہائے بھابی دلہن قسم لے لو جو میں نے کسی کو دیکھا ہو، مجھے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اماں تو پاس بیٹھی خود ہی منہ میں لاڈے سیویاں بھرے جارہی ہیں بھر میں..... "

"کیوں ری بدذات! تو نے دیکھا نہیں تو آپ ہی آپ یہ غیب حال کیسے معلوم ہوگیا؟"

"اب بھابی دلہن کو کون بتائے! بھیا منگیتر کو دیکھے بنا کیسے رہا جاسکتا ہے۔؟ ہائے اتنی دور سے تو بیچارے عید کو آئیں اور کوئی انہیں دیکھے بھی نا! ایسا کیا بھابی نے کبھی بھیا کو نہ دیکھا ہوگا۔" وہ جان بوجھ کر ہاتھ ہلانے لگتی کہ چوڑیاں کھنک اٹھیں اور وہ بھولیں کہ اتنی دور آنے کی محنت اکارت نہیں گئی۔ "ہاں جی تمہیں دیکھ لیا ہے۔"

بچپن کی حدوں سے نکل کر جوانی کی سرحد میں داخل ہوئے ابھی تو تھوڑے بہت دن باقی تھے۔ مگر اکو ماں یہ تو جانتی تھی کہ سلطان میاں کے نام سے ان کی کلیاں مہکنے والی ہیں۔ اب جو جوانی موت کی خبر ان کے کانوں میں پڑی تو اسی دم وہ کلیاں مرجھا گئیں۔ اتنے دیر میں کتنے خیال آئے اور چلے گئے۔ آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ اماں ایسے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

"ہائے میری اکو کا کیا بنے گا؟ ہائے میری لاڈلی!"

اماں کو یوں روتے دیکھ کر اختر کی آنکھوں سے بھی ندی سی ابل پڑی۔

(۲)

اُس دن صبح اختر اپنے بستر پر سے اٹھی تو چھوٹی سی ریشمی رضائی کو لات مار کر دور گرا دیا۔

"اتنی سی رضائی ہے کہ میرے پلے باندھ دی۔ سر ڈھانکوں تو پیر باہر نکل پڑتے ہیں۔ پیر ڈھانکوں تو کم بخت سر کھلا رہ جاتا ہے۔" وہ بستر پر سے انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ خانم بیگم نے سہم کر سر اٹھایا۔

جوانی یوں چپکے سے کیسے گھر گھس گئی؟ ارے بیٹی کی جوانی تو ڈھول تاشے بجاتے آتی ہے پہلے آنکھوں کی پلکیں گہری اور لمبی ہوجاتی ہیں، پھر آنکھیں آپ ہی آپ جھکی جھکی رہنے لگتی ہیں۔ بازوؤں پر صندل کی شاخوں کا گمان ہوتا ہے اور پیر سونے سونے بھی رہیں تو لگتا ہے چلتے میں پائلیں سی چھنک رہی ہیں۔

یہ کیسی جوانی ہے خدایا! جو یوں خاموشی سے گھر میں گھس گئی۔ پلکوں کی وہ جھالر سی جھپی کیوں تھی۔؟ آنکھوں میں وہ شرمیلا انداز کہاں تھا؟ بازو صندل کی شاخوں ایسے کب لگے؟ اور تو اور چلتے میں کبھی پائل نہ چھنکی اور یہ سب کچھ ایک ہی رات میں ہوگیا۔ راتوں رات اس باغ پہ بہار کیسے آگئی کہ گال، آنکھوں پہ پلکوں کا پردہ دبیز و دبیز ہوگیا۔ آنکھیں جھلل جھلل قندیلیں سی بن گئیں، رہ رہ کر جگمگاتی، اور کانچ کی سی قندیلیں، بازوؤں میں رس بھر گیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ کب ہوا۔؟ اور

جب اکو ماں بستر سے اُٹھ کر حمام تک گئی تو خاموش آواز کے ساتھ یہ چھاچھم کیسی۔؟ مگر اب بہار کو قید کیسے کیا جا سکتا ہے۔ سرسراتی ہوائیں تو آپ بتا دیتی ہیں۔" ابھی بہار آگئی۔ بہار آگئی بہار آگئی۔"

عارفہ بیگم کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ وہ سہمے ہوئے دل سے اس بہار کی منتظر تھیں بھرے گھر میں یہ ایسی کیسی بہار آئی کہ بجائے خوشی کے دل ڈوبنے لگا۔

عزیز میاں کے لئے حقہ گرم کر کے بیٹھک میں لے گئیں تو عارفہ بیگم یوں چپ چاپ تھیں۔

"کیا بات ہے۔؟" عزیز میاں حقہ گڑگڑا کر بولے۔

انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ذرا بے بسی سے بولیں:۔

"اپنی اکو ماں سیانی ہو گئی ہے۔"

اپنے لگائے ہوئے درخت پر پھول کھلیں، بہار جوبن پہ آئے تو چہرے پہ ہنسی آ تی ہی ہے۔ خوش ہو کر بولے:۔

"اچھا۔"

عارفہ بیگم نے حیرت سے میاں کو دیکھا۔" آپ تو یوں مطمئن ہیں، ایسے خوش ہو رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں کہوں یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہوئی ؟"

عزیز میاں نے حقہ گڑگڑایا۔

" اور مجھے تو اس میں رنج ہونے کا کوئی تُک نظر نہیں آتا۔ بھلا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، اس میں فکرمند ہونے کی کیا بات ہے کہ بیٹی جوان ہو گئی۔؟"

عارفہ بیگم نے ترس بھری نگاہوں سے نادان میاں کو دیکھا۔

" مزدور اپنا بوجھ زمین پہ اتار کر خوش ہوتا ہے، سر پہ دھرا رہے تو اس کی جان کھوکھلی پڑ جاتی ہے۔"

عزیز میاں نے چونک کر بیوی کو دیکھا، پھر خود کو مطمئن بنا کر بولے:۔

" وہ تو ٹھیک کہا تم نے، مگر خواہ مخواہ فکر مول لینے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے بھلا۔؟"

"خواہ مخواہ کی فکر۔؟" وہ درد سے مسکرائیں۔ "یہ تو اتنی بڑی پریشانی کا سودا ہے۔ بیری تو اسی سے جان آدمی ہوئی جا رہی ہے۔

ارے دنیا کی بیٹیاں جوان ہوا کرتی ہیں، مگر کہیں ایسے یوں پریشان ہوا کرتی ہیں۔؟ ہم نے تو ایسے موقعوں پر ماؤں کو مٹھائی بانٹتے دیکھا ہے۔ خوشی خوشی عزیز رشتہ داروں کو جوڑتی ہیں، گانا بجانا ہوتا ہے، ہنگامے ہوتے ہیں۔ اور بات ہے بھی ٹھیک، ماں بچوں کے کھلے پڑاؤں

نہیں ہوتا، وہ تو پھولوں نہیں سماتا کہ چلو میری محنت ٹھکانے لگی۔"

"مگر ہمارا بھول ..... " وہ آگے کچھ نہ بول پائیں۔

"ہائے! آپ اتنی بڑی بات بول رہے ہیں۔ بھلا اس کی شادی کیسے ہوگی۔؟"

عزیز میاں اور زیادہ حیرت زدہ ہو گئے۔

"کمال کی بات ہے! ارے ہماری اکو ماں اتنی حسین، اتنی پیاری ہے کہ اس کے لئے ستر پیام آئیں گے اور ایک سے بڑھ کر ایک آئیں گے بلکہ تمہیں تو یہ پریشانی اور الجھن ہو گی کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں۔"

عارفہ بیگم نے آنکھوں میں امڈے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے سے پونچھ لیا۔ "کاش ایسا ہی ہوتا۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔؟" میاں چونک کر بولے۔ "اس میں یوں رنجیدہ اور آزردہ ہونے کی کیا بات ہے بھئی۔؟ ہوگا اور ایسا ہی ہوگا۔"

"مگر آپ اتنی بات بول رہے ہیں، ہماری اکو کا منگیتر سال بھر پہلے ہی جان جان بحق ہو چکا ہے۔"

عزیز میاں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"ہم چاروں کی کتنی خواہش تھی کہ یہ رشتہ ہو جاتا! ہو جاتا مگر قسمت کو کیا کر سکتے ہیں۔ ایسے جوڑ کو جوڑ تھا، چاند سورج کی جوڑی تھی۔ مگر عارفہ بی بی خدا کی مصلحت خدا ہی جانے۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے، سوائے افسوس کے!"

دونوں خاموش ہو گئے، صرف حقہ کی گڑگڑاہٹ باقی رہ گئی، عارفہ بیگم نے خاموشی سے کہنا شروع کیا۔ "کل دلہن بیگم کہہ رہی تھیں، حسینہ بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"پھر۔؟" عزیز میاں نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"ان کا خیال تھا کہ اختر کو اپنے بیٹے کو ....."

عزیز میاں نے مارے خوشی کے حقہ کی نے چھوڑ دی۔ "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ اختر کے لئے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ابھی دیکھنا اس کے لئے ایک چھوڑ سو آئیں گے۔ ہاں مگر وہ لڑکا کرتا کیا ہے۔؟"

"شاید ریلوے میں ملازم ہے۔"

"بھلا تنخواہ کیا ہے اس کی۔!"

"ساڑھے تین سو۔" وہ مرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

انھوں نے خوشی خوشی پھر حقہ کی نے پکڑ لی۔ "تب تو کچھ ٹھیک ہے۔ آج کل کے زمانے میں ساڑھے تین سو کچھ کم تو نہیں ہوتے۔ اور پھر وہ بی۔ اے پاس بھی ہے نا۔"

بیگم کچھ نہیں بولیں تو پھر بولے:۔

"اور ماشاءاللہ صورت شکل بھی خاصی ہے۔"

وہ پھر حقہ گڑگڑانے لگے۔ عارفہ بیگم ٹھنڈے لہجے میں بولیں:۔

"تو حسینہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ لڑکی تو ایسی ہے چاہو تو چاند سورج کے مقابل بٹھا دو۔ مگر ایسی منحوس لڑکی کو اپنی بہو بنالیں جس نے آگے ہی اپنا منگیتر کھا لیا ہو۔۔"

"منحوس" عزیز میاں چلائے۔ نے پھر ہاتھ سے چھوٹ گری۔ انھوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ "جس نے آگے ہی اپنا منگیتر کھا لیا ہو۔"

کتنی ہی دیر خاموشی رہی، پھر عارفہ بیگم بولیں:۔

"بس اتنے دنوں سے مجھے تو یہی دھڑکا لگا ہوا ہے، ورنہ کون بیٹی ایسی ہوگی جسے پیام نہ آتے ہوں، بُرے بھلے، کھٹے میٹھے، کیسے ہی بیر ہوں، پتھر تو مارے ہی جاتے ہیں۔ مگر......"

دونوں نے بڑی بے بس نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ غم نے جیسے ان کے چہروں کی تازگی چھین لی ہو۔ دونوں کی آنکھیں خشک اور بے جان نظر آ رہی تھیں۔

مگر عزیز میاں اور عارفہ بیگم جس بات سے پریشان تھیں وہ تو کوئی بات نہ ہوئی کیونکہ ابھی مہینہ بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ اکو ماں کے لئے نسبت والے آگئے۔ لڑکا شہر میں کوئی ملازمت کرتا تھا پچیس چھبیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ یعنی یہی کوئی دو ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ یعنی باپ نے ان باتوں میں سے ایک کو بھی بُرا نہ جانا۔ چار پانچ برس گزر ہی گئے۔ دو چار بچے ہوں گے تو عمر کا فرق مٹ جائے گا۔ جسم بھاری ہو جائے گا تو خود اکو ماں میاں سے نکلتی ہوئی دکھائی دے گی۔ تنخواہ کا کیا ہے۔؟ کھانے والی اپنی قسمت سے کھاتی ہے۔ بڑی بھاری جہیز کرکے بھی دو مگر کھانے والی کے نصیب میں نہ ہو تو ہرا بھی سوکھا ہو جائے۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔"

اور خاندان کا کیا پوچھنا پاچھنا تھا؟ مسلمان تھے اور شریف تھے، یہی بس تھا۔ منگنی کے وقت انگوٹھی پہنانے جب انھوں نے لڑکی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو گو کہ یہ عین ناممکن ہی بات تھی (بھلا شریفوں میں کہیں یوں بیٹیوں کی صورت شکل دیکھی بھالی جاتی ہے) پھر بھی عارفہ بیگم نے مصلحت اسی میں جانی کہ چپکے سے دلہن کی شکل بتا ہی دیں، ورنہ کل کلاں کو وہ کہنے کو بیٹھیں گی:۔

"بھئی کیا شادی کرتے؟ لڑکی کی ایک جھلک تو نہ بتائی۔ اب ہم کیا جانیں کیا عیب تھا جو بی چھپائی گئی، اے کیا ہم مردے تھے کہ بٹیا کو کونے میں لے جا کے بٹھا دیا؟"

بیٹی کی شکل جس نے دیکھی اسی کے منہ سے "ہا" نکل گئی۔ کسی منہ پھٹ نے تو منہ پھوڑ کے پوچھ بھی لیا:۔

"اے اتنی چاندی صورت پر اتنی عمر ہو گئی۔؟"

عارفہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے کہا:۔

"دوئی بہن چاندسی صورت کا کیا ہے۔! بیٹی سیانی ہوتی تبھی وداع کرتے نہ کہ یوں ہی کچی ہنڈیا دستر خوان پر برت دیتے ہیں اور اتنی کم عمری میں ان کے بیاہ کی مرضی بھی نہ تھی۔"

محلے والے میں لوگ یوں ہاتھ لمبے کر کر کے روٹے پکڑنے کو تو جاتے نہیں ہیں، چپ رہ گئے مگر عارفہ بیگم کے جی کو ادھر کھٹکے لگ گئے۔

"نکاح خوانی کے چار بول جب تک نہ پڑھائے جائیں، میرا جی تو یوں ہی دھڑکے گا۔ پھر بعد کو نیک بخت پر جو بھی گزرے سو گزرے۔"

"کیوں کیا ہوا۔؟" میاں ہڑبڑا کر بولے۔

"ہوتا کیا؟ بیٹا کی صورت دیکھی تو وہیں سامنے ہی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ایسی چاند سی صورت والیاں تو چنگوڑے میں ہی دوسرے کی ہو جاتی ہیں اور یہ تو اتنی بڑی ہو گئیں کہ چلنے میں زمین ہلا رہی ہیں۔"

عزیز میاں کھنجا کر بولے :۔

"ہونہہ! بکنے والے کو بکنے دو۔ شادی ہو جائے گی تو آپ ہی سبھوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔"

محلے والوں نے جب بنارسی سرخ دوپٹہ اڑھا کر انگوٹھی پہنائی تھی تو بنا، سنگار پیار کے اختر کی صورت ایسی چاند سی چمکنے لگی کہ سب ہی لوٹ پوٹ ہو گئیں اور جاتے جاتے بول گئیں:۔

"دوئی میں جلدی اپنی بہو کو بیاہ لے جاؤں گی۔ ایسے اجالے تو میرے گھر میں ہونے چاہییں بہن؟" وہ عارفہ بیگم سے مخاطب تھیں۔

"ہاں بہن۔ آپ ہی کی لڑکی ہے، جب بھی لے جائیے چاہے اسی وقت۔"

"نا بہن، اس وقت کہاں لے جا سکتی ہوں؟ ابھی تو بیٹے کو چھٹی نہیں ملی، ورنہ میرا بس جو چلتا تو ساتھ ہی لے کر چلی جاتی۔"

کہاں تو ہر اتنی پیاری لگتی کہ بار بار بہو کو دروازے میں سے پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھیں۔ اور جلد سے جلد اٹھائے جانے کا جتن کرتا یا اب دو مہینے چھوڑ چھ مہینے گزر گئے اور کوئی خیر و خبر ہی نہیں۔

سہاگن

ایک ایسی ہی بجھی بجھی سی شام کو سمدھیانے کا آدمی ایک پرچی پکڑا گیا۔

بہن صاحبہ!

آداب عرض ہے۔ ہم تو بیٹی کی پیاری شکل دیکھ کر تب ہی چونکے تھے کہ ضرور دال میں کالا ہے مگر آپ نے بات کی بھنک نہ جانے دیا۔ وہ تو بھلا ہوا کہ ہمیں پہلے ہی پتہ چل گیا کہ صاحبزادی منحوس ماری ہیں، اپنے منگیتر کو کھائے بیٹھی ہیں، ورنہ جانے ہمارے گھر کا کیا حشر ہوتا۔ بہن آخر آپ کے دل میں بھی تو محبت تو ہوگی ہی، پھر آپ اپنی اولاد کے لئے دوسرے کی اولاد کا بُرا کیوں چاہتی ہیں؟ آپ کے رویہ سے ہمیں سخت تکلیف پہنچی ہے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے بے چاروں کا جنہوں نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا اور صورت حال سے مطلع کیا، ورنہ ہمارے گھر بھی آ تو بول جاتا۔ ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔

امید ہے کہ آپ ہمارا سرخ دوپٹہ اور سونے کی انگوٹھی، جو پورے سات ماشے کی تھی، واپس کر دیں گی۔

آپ کی بہن، سلطانہ بیگم

پھر ہوا کے زور سے اڑتی اڑتی، دیواروں سے سر ٹکرایا۔ برآمدوں میں گھومتی پھری، دالانوں میں رُکی اور پھر ہوا کے ایک زناٹے دار جھکڑ کے ساتھ اکو میاں کی گود میں جا پڑا۔

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!"

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!"

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!!"

ہواؤں نے زور باندھا اور چلائیں:۔

"صاحبزادی منحوس ماری ہیں!"

دالان، پیش دالان، برآمدے خاموش آوازوں سے چلانے لگے:۔

"ہاں جی ۔۔۔ صاحبزادی منحوس ماری ہیں!"

بی بی نے گھبرا کر میاں کی صورت دیکھی:۔

"میں نہ کہتی تھی کہ اب زندگی نے آزمائش شروع کر دی ہے!"

میاں کچھ نہ بولے۔ بولنے کو تھا بھی کیا؟

"جانے ہم سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہوگا جو یوں راندے جا رہے ہیں۔" عارفہ بیگم تھکی ہاری سانس لے کر بولیں۔

"دکھ سکھ سب اسی کی دین ہے بی بی، برداشت کرو۔"

عارفہ بیگم کے آنسو بہہ اٹھے۔

"نہیں ہوتا برداشت۔ بالکل نہیں ہوتا۔ کھایا پیا انگ نہیں لگتا، راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ دل کا چین، آرام مٹ گیا۔ ہائے میری معصوم بچی!"

"برداشت کرو بی بی، برداشت کرو۔ اوپر والے کے پاس انصاف ہے۔ ہاں دیر ہے گر اندھیر نہیں۔ برداشت کرو!"

(۳)

دوسرے دن عارفہ بیگم روز کی طرح صبح صبح چائے کی پیالی لے کر میاں کے بستر کے پاس گئیں تو وہ روز کی طرح بی بی کے قدموں کی چاپ سن کر اُٹھ کر نہ بیٹھے۔ بی بی نے کندھا پکڑ کر ہلایا۔

"چائے لیجیئے۔ کلی کا پانی بھی رکھے جا رہی ہوں"

عزیز میاں منہ اندھیرے ہی اُٹھا کرتے تھے۔ پاس والی مسجد میں جا کر نماز پڑھ کر آتے۔ منجن مل کر دانت صاف کرتے، منہ ہاتھ دھوتے، پھر قرآن شریف لے کر بیٹھ جاتے۔ پارے دو پارے پڑھ کر وہیں پلنگ پر لیٹ جاتے۔ سورج کی کرنوں کے ساتھ ساتھ ادھر ہو لیے بھی چل جاتے۔ بی بی میاں کو سوتا پا کر جلدی جلدی خود اپنے ہاتھوں چائے تیار کرتیں اور چائے کی پیالی اور کلی کے لئے پانی لے کر جگانے آجاتیں۔ نیند گہری ہوتی تو وہ پانی اور چائے کی پیالی وہیں پٹی کے سرہانے دھو کر چلی جاتیں۔

پانچ دس، منٹ کے بعد پھر آواز دیتیں:-

"اے اُٹھئے بھی۔ ٹھنڈی پالا ہو جائے گی تو کیا مزہ آئے گا" وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے

آج بیٹھے بیٹھے انہوں نے آواز دی:-

"اجی اٹھئے بھی" گر میاں یُوں ہی سر سے پیر تک رضائی اوڑھے پڑے رہے۔

پانچ، دس، پندرہ، بیس منٹ چھوڑ گھنٹہ گزر گیا۔ بی بی اُٹھیں اور الجھ کر بولیں

"دوئی ایسی بھی کیا نیند کہ جواؤں سے بڑھ کر ہو گئی۔ اس سے جلد تو نظیر میاں اُٹھ جاتا ہے۔"

قریب آ کر زور سے شانہ ہلایا۔ پھر بھی نہ اُٹھے تو منہ پر سے رضائی کھینچی۔ بڑی مشکلوں سے رضائی کھینچ سکیں۔ وہ منہ پر جھکیں۔

"دوئی کم بخت چائے تو دیکھئے کہ ....."

مگر الفاظ ان کے ہی رہ گئے۔ اک دم وہ چلانے لگیں، ۔

" ارے دیکھو تو ۔۔ سنو تو ۔۔ یہ تو بولتے ہی نہیں ! ۔ "

بیٹا، بیٹی اور بہو دوڑتے ہوئے آئے۔ رضائی الگ کر کے دیکھا کہ ابّا میاں ہمیشہ کے لئے سو چکے ہیں۔

(۴)

جیسا کہ وقت عارفہ بیگم پر پڑا، خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ امیر گھر کی لاڈوں، نازوں میں پلی اکلوتی اولاد تھیں۔ بھلا گھر میں کس بات کی کمی ہوگی؟ شادی ہو کر سسرال کو آئیں۔ یہاں بھی اللہ کا فضل تھا، بڑی ساری زمینداری تھی۔ اگر روپوں کو کھونڈتی نہ چلتی تھیں تو یہ بھی نہ تھا کہ پیسے کو ترستی ہوں۔ ہزاروں سے اچھی حالت تھی۔

پھر سسرے مرے تو جائداد کا بٹوارہ ہوا۔ تین دیور، دو جیٹھ، ساس، نندیں، سب کے حصّے بکھرے گئے، پھر بھی خوش تھے۔ یوں کہ اپنے آگے اپنی دال روٹی ۔۔ وہی بس تھی۔ اگر دل کو اطمینان و سکون میسّر رہے تو دال روٹی تو پھر بھی اچھی بات ہے، فاقے بھی بُرے نہیں لگتے۔ اور اطمینان و سکون کیوں نہ ملتا؟ میاں دل و جان سے وارے۔ اولاد بھی اللہ نے دے رکھی تھی ایک بیٹا، ایک بیٹی، زندگی سکون سے گزرتی تھی۔ گھر کی آمدنی تو تھی ہی ۔ جوان ہوئے تو بیٹے ظہیر میاں بھی نوکری سے لگ گئے۔ یہیں بڑے زمیندار خلیل خاں کے کاموں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ ڈھائی سو، دو سو اُن کے بھی آتے تھے۔ بیٹا جوان ہو تو ماں باپ کو اپنے دکھ درد بھول جاتے ہیں اور پھر کما دولت بھی ہو تو پھر گھر میں خوشیوں کی بھری برسات برسنے لگتی ہے۔

مگر یہ تو پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے کس کے نصیبوں میں کیا بدا ہے۔

بیٹی کی نسبت بھی بچپن ہی سے ظہیری بہن کے بیٹے سے لگی ہوئی تھی۔ بیٹے کی شادی جٹھانی کی بیٹی سے ہو چکی تھی، کسی بات کی، اگلی پچھلی کی فکر ہی نہ تھی، اطمینان سے بیٹھے تھے کہ بیٹی جوان ہوگی تو بس اٹھالے جائے گی۔ گھر میں جی بہلانے کو پوتا تھا اور دوسرے کی آمدنی۔ مگر بیٹھے بٹھائے یہ ہوا کہ داماد سہرا بیچا باندھنے سے پہلے ہی کفن لپیٹ بیٹھے۔ بھرے گھر میں دھول اُڑ گئی۔ جوان بیٹی کا ساتھ اور سارے میں یوم ہو گئی کہ منحوس ا ری ہے بُرے بھلے میں دل کو سہارنے والے میاں تو سنگی ساتھی تھے، سو وہ بھی ان دکھوں کو سہار نہ دے پائے۔ اور جن سے آنکھیں موند کر ایسے سوئے کہ پھر کبھی نہ اُٹھے۔

" اب کیا ہوگا؟ ۔ " عارفہ بیگم اپنے آپ میں بس یہی سوچے جاتیں اور کڑھتی جاتیں بیاہ

کا چالیسواں ہوتے ہوتے اس کڑھاپے نے انھیں بڑھاپے کی آخری سرحد پہ لے جا کر بٹھا دیا۔ آنکھیں سیاہ گڑھوں کے اندر چلی گئیں۔ ناک کا بانسہ نکل آیا، ہاتھ پیر جھولا ہو گئے۔ دیکھ کر ترس آتا۔ اگر اکو میاں کا ساتھ نہ ہوتا تو حالت اتنی تباہ ہوتی اور اک دم سے اتنی بڈھی نہ ہو جاتیں مگر اب تو بھرے گھر میں کوئی جیا یا مرا تھا تو بس اکو میاں۔ بیٹیوں کی جوانیاں تو پونم کا چاند ہوتی ہیں جو بادل کی اوٹ میں رہے یا نہ رہے بس چمکے ہی جاتا ہے۔ بادل نہ ہو تو پھر تو کیا کہنا۔ صاف سیدھی طرف آسمان پہ جگمگاتا رہتا ہے۔ مگر کالی سیاہ بدلیاں ڈھانپے رہیں پھر بھی اندر سے جھلک مارتا ہی ہے۔ ایسے چاند کو کون سی بدلی ڈھانپنے کا حوصلہ کرے جس نے اپنے پورے پندرہ دن پورے کر لئے ہوں ۔؟

اتنے دن ہو گئے تھے، کوئی تو نہ پلٹا۔ جالے، وہم، وسوسے اور اندیشے گھیرے رہتے۔ وہاں نہ بیٹی کی خوبصورتی کام آئے نہ روپیہ پیسہ، سلیقہ کام آئے نہ تعلیم و تربیت۔ جارو بیگم کھاتے پیتے بیمار ہو گئیں، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے [illegible] روتے بس یہی فکر، یہی دھن گھن کی طرح کھائے جاتی۔

"اکو میاں کا کیا ہوگا۔؟ اکو میاں کا کیا بنے گا۔؟"

یہ گت تو آج کل سے نہیں اسی گھڑی سے نظر آ رہی تھی جب سے کہ سلیماں جان جہان اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ کوئی ننھی منی سی امید کی کرن پھر بھی باقی تھی ہی جو بھرے اندھیرے میں اجالا کرنے کو کافی تھی۔ وہ میاں کا ساتھ تھا، مگر وہ کرن بھی جلتی بجھتی آخر کو دم توڑ گئی ۔

سسرے کی موت نے دلہن بیگم کو شیر بنا دیا۔ پہلے یہ تھا کہ زمینداری کی آمدنی اور ظہیر میاں کی تنخواہ مل جل کر آتی اور گھر کا خرچ چلتا تھا اور بغیر کسی چپقلش کے گزر ہوتی تھی۔ اب بھی وہی حال تھا۔ مگر ادھر عزیز میاں کیا مرے کہ دلہن بیگم نے یہ فرض کر لیا کہ گھر کی ساری ضرورتیں بس میرے میاں کے پیسے سے پوری ہو رہی ہیں۔ اور یہ خیال جو ان کے دل میں جڑ پکڑتا گیا تو انھوں نے ساس نند کے دل چھید ڈالے۔ میاں کے دل بھرنے میں کوئی جتن نہ اٹھا رکھا۔ باپ کی موت پہ جانا دبیٹے کو ملنے ہی تھی، اور مل بھی۔ اب ماں بہن کا کیا رہ گیا تھا؟ بس دو وقت کی روٹی اور تن بھر کپڑے کی حقدار تھیں۔ وہ پرسے بھلے مل جاتا تھا، نہیں ملتا تو کیا کر لیتیں؟ اوپر سے کوئی چیز غلطی سے گر پڑ جاتی تو منہ زور جوتی کو طعنے پڑتے۔

"دوئی بی دیکھ کر نہیں چلتیں۔ یہ ٹھوکریں مار کر کیوں چلتی ہو؟ دودھ کا پیالہ گرا دیا، اب رات کو منا روئے گا تو کیا پلاؤں گی؟ تمہارا خون؟"

اس پر بس ہوتا تو سہارا جا سکتا تھا، مگر کنواری نند کو ایسے طعنے دیتے بھی نہ چوکتیں:۔

"میری توبہ! اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ لڑکی کی شی اکھاڑ دی۔ یوں جوانی زور پر آئی ہوئی ہے تو جا کر میاں سے کشتیاں کیوں نہیں لڑتیں۔"

عارفہ بیگم سہم کر بولیں۔ دلہن بیگم کنواری بٹیا کے سامنے خدا کے لئے ایسی گمراہ کن باتیں مت کیا کرو۔ وہ کیا سوچے گی؟"

"اے لو! سنو! گمراہ کن باتیں! جیسے تمہاری بٹیا تو بڑی بھولی ہے نا۔ سکھی سہیلیوں سے گھنٹوں سر جوڑے کیا باتیں ہوتی ہیں؟ کوئی جانتا ہی نہیں جیسے!"

"تمہارے آگے بھی اولاد ہے دلہن بیگم، یوں جھوٹے الزام نہ تراشو! کون اس کی ڈھیر ساری سہیلیاں جڑی ہوئی ہیں کہ باتیں مٹھارے گی۔؟"

دلہن بیگم کو قرار نہ آتا۔ ننھے بچے کے منہ میں [illegible] پھیرتے ہوئے بولیں:۔

"اب کیا کیا سنائیں کیا کیا دیکھتے ہیں، میرے [illegible] ننھی ننھی پیار کرتی ہے کہ بس میں چھاتی ہی باقی رہ جاتا ہے۔ بے چاری کرے بھی کیا؟ بچوں کے لئے دل چاہتا ہوگا، مگر ماں نے تو کوٹے سے لگا کر بٹھا رکھا ہے۔ اس کے ارمان نکلیں بھی کیسے؟"

اختری کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ "بھلا کون پھوپھی ہوگی جو اپنے بھتیجوں سے پیار نہ کرتی ہوگی؟ بھلا کیا میں اس لئے پیار کرتی ہوں کہ میرا جی ماں بننے کو ترستا ہے؟" دلہن بھابی اتنی گہری اور گھنی ہیں، اسے آج پتہ چلا۔ اماں تو ادھر سن ہی رہ گئیں۔

"دلہن بیگم خدا کے لئے یوں اپنا آپ بھول کر بات مت کرو۔ بھلا کہیں کنواری نندوں کو یوں طعنے دیئے جاتے ہیں۔"

"اے لو طعنے دیئے ہی کس کم بخت نے ہیں؟ جو حقیقت تھی وہ بیان کر دی۔ ایسی ہی کڑی حقیقت طعنے بن بن دل چھیدتی ہے تو بٹیا کے ہاتھ پیلے کیوں نہیں کر دیتیں؟" دلہن بیگم نے جانتے بوجھتے صاف طعنہ مارا۔

"پیدا کرنے والے نے غم دیا ہے بی بی، تو خوشی بھی وہی دے گا!" عارفہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔

اکو ماں اب تک عمر کے ایسے دور میں تھی کہ جوانی کا احساس تو تھا، مگر اپنے مقدر کی تباہی کو اس سنجیدگی سے نہ سوچا تھا۔ اس کے بجائے تو یہ کوئی بات ہی نہ تھی کہ کنواری بیٹھی ہوں۔ سب ہی لڑکیاں ایک خاص عمر تک کنواری رہتی ہیں اور پھر ایک نہ ایک دن دلہن بن جاتی ہیں اور

پھر سہاگن کہلاتی ہیں۔ دیر سویر سب ہی پر یہ سب گزرتی ہے، مگر سجاو[illegible] آئے دن کے طعنوں نے تو اس کے خوابیدہ جذبات میں ہلچل سی مچادی۔ وہ رہ کر وہ اپنے سراپے کو آئینے میں جاجاکر دیکھتی اور سوچتی۔ "ہائے میری بارات کب چڑھے گی۔"

اور یہ بات تو اس پر کھل ہی چکی تھی کہ منگیتر کی موت نے اسے سارے میں منحوس قرار دے دیا ہے۔ پھر کون ایسا ہی گردے والا تھا کہ دیکھتے بھالتے اپنے بھرے پرے گھر کی تباہی کے لئے منحوس کو بیاہ لے جاتا! سامنے ہی بوڑھی ماں تھیں جو ہر لمحہ موت کی طرف تک رہی تھیں۔

"میں نہ ہوتی تو اماں کو یہ غم کیوں کھاتا۔" غم کو ہلکا کر[illegible] دونوں ماں بیٹی کے پاس یہی تھا کہ آنسو بہائیں، اور اب تو وہ حد آرہی تھی جہاں آنسو بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

ایک دن ماں نے بیٹے سے کہا: "بیٹا ظہیر میاں! جوان بہن کا بوجھ سر پر ہے تمہیں فکر نہیں ہوتی؟ کوئی پیام ڈھونڈو نا[illegible]ر کب تک بٹھائے رہوگے؟"

ظہیر میاں نے نوالہ اٹھاتے اٹھاتے ماں کو دیکھا اور سنجیدگی سے بولے: "ہاں ہر گھر پر اب جاکر دستک دوں گا اور کہوں گا کہ بھئی میری ایک جوان بہن ہے، تمہارے ہاں کوئی لڑکا ہو تو میری بہن کو کروالو نا!"

ماں نے حیرت اور بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔

"دوئی بیٹا ایسی جلی کٹی باتیں کاہے کو کرتے [illegible] نے [illegible]یوں کب کہا؟"

"اور آپ کا مطلب کیا ہے؟ بس مجھے اتنا ہی کام تو رہ گیا ہے کہ شاطر بن کر پیام ڈھونڈتا رہوں۔ انسان دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔ بھلا کیا لڑکے بازاروں میں مولی گاجر کی طرح بکتے ہیں کہ گئے اور سیر دو سیر تلوا لائے۔"

"میں نے ایسا تو نہیں کہا میاں! ہاں ذرا خیال دلانے کی بات تھی میری بیٹی ہے تو تمہاری بھی تو بہن ہے۔ تمہارے آس پاس دوست احباب تو ہوں گے ہی۔ خاندان کی بات ایسی ہے کہ سب ہی جانتے ہیں کہ سومیاں کی جوان موت سے ان کو ماں پر یہ قہر ٹوٹا، باہر والوں کو مشکل ہی سے پتہ چل سکتا ہے۔ اگر کسی سے کوشش کر کے بات چلا سکو تو اچھا ہی ہے۔ تمہارے چچا تایا کی اولاد ہیں، یا تو شادی شدہ ہیں یا پھر ان کی اس سے چھوٹی، ورنہ میں آپ ہی منہ پھوڑ کر بول دیتی کہ مرے، منہ کو اٹھالو۔"

"بھلا میرے دوستوں میں کون اس لائق ہے؟ ابا میاں کوئی ایسے ویسے آدمی تو تھے نہیں، ہماری برابری کا کون ہے؟"

سہاگن

اماں نے دبی زبان سے کہا:۔

"شکور میاں تو مجھے بھلے خاصے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ برابری وبرابری کا سوال اٹھا بیٹھو بیٹھے۔ بس شادی ہو جائے۔ یہی غنیمت ہے، لاکھ تمہارے باپ ماں کا نام بڑا تھا مگر شکور میاں کے باپ کون گرے پڑے ہیں! بس غریبی سے مارے گئے، ورنہ خاندان تو ایسا ہے کہ کوئی کھوٹ خرابی نہیں۔ اور میرے خیال سے شکور میاں کی تنخواہ چار سو سے کیا کم ہوگی؟"

"اماں!" ظہیر میاں ہاتھ روک کر بولے "پہاڑ کتنا بھی اونچا ہے آسمان سے نیچا ہی رہتا ہے شکور میاں لاکھ امیر کبیر ہو جائیں، ہماری ساکھ کو کیا پہنچیں گے۔ میں کب نہیں کہتا کہ کھاتے کماتے نہیں ہیں، مگر ان کی خودی بہت نہ پڑے گی کہ اس گھر میں پیام لے جائیں جہاں سے ان کی روزی بٹتی تھی۔"

"روزی بٹتی تھی تب بٹتی تھی۔ اب تو ادھر نے ناک اونچی کر دی ہے۔ کہنے والے یہی کہیں گے ناک عزیز میاں کی بیوی نے اپنی بیٹی فقیروں میں دے دی، سوکتے پھریں، ہماری بیٹی تو خیر سے اٹھ جائے گی۔

کسی زمانے میں جب عزیز میاں کا بول بالا تھا۔ تب انھوں نے رحیم بیگ کے بیٹے شکور میاں کے لئے وہ کچھ کیا جو ایک باپ ہی اپنے اولاد کے لئے کر سکتا ہے محلے ٹولے کے بچے اسکول جاتے تو شکور میاں بھس بھس روتے۔

"میں بھی اسکول جاؤں گا، میں بھی پڑھوں گا۔"

اسکول جانے کے لئے کتابیں لگتی ہیں، فیس لگتی ہے، اچھے کپڑے لگتے ہیں اور یہ سب ان کے پاس کہاں تھا؟ یوں ہی ایک دن عزیز میاں رحیم بیگ کے ہاں بیٹھک میں بیٹھے تھے کہ اندر سے دھما دھن مارنے کوٹنے کی سی آواز آنے لگی۔

"یہ آواز کیسی ہے؟" وہ حیرت سے ادھر اُدھر دیکھ کر بولے۔

رحیم بیگ ہنسنے لگے: "بی بی باجرے کی بیٹے کہاں سے آگئے؟" وہ حیرت سے بولے۔

"جی جناب لونڈے نے دھوم مچا رکھی ہے کہ اسکول میں پڑھوں گا۔ اس کا باپ کوئی وزیر اعظم تو ہے نہیں۔ سالا پڑھے کیسے؟ روز ہی سبق پڑھاتا ہے اور کبھی ماں سے پٹتا ہے اور کبھی باپ سے یہ

عزیز میاں غصے سے بولے:۔ "خود جاہل رہے، اولاد کو بھی جاہل رکھو گے؟ داخل کر کیوں نہیں دیتے؟ ایسی کون جاگیر چلی جائے گی اس کی پڑھائی میں؟"

شکور میاں اسکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ مہینے کے مہینے چپکے سے فیس، کتابیں، کپڑے، قلم اور کاغذ سب کچھ پہنچ جاتا۔ باپ کو کبھی پریشانی کا احساس ہونے ہی نہ پایا۔ وہ تو اچھا تھا کہ اختری کی نسبت بچپن ہی سے خالہ زاد بھائی سے طے تھی ورنہ لوگوں نے پہلے تو وہ لگا کر سی افواہ اڑاتی چاہی کہ . . .

"میاں جی بیٹا کے لئے بر ڈھونڈ رہے ہیں"

ایک درجے سے دوسرا درجہ، دوسرے سے تیسرا، تیسرے سے چوتھا اور پھر وہ دن آیا کہ شکور میاں نے ایم۔ اے پاس کر لیا۔ اور اب تو وہ سوٹ بوٹ میں دکھائی دیتے تھے اور مہینے کے ختم پر ساڑھے چار سو کے کڑکڑے نوٹ جیبوں میں ٹھونسے گھر آتے۔ شہر میں گورنمنٹ سروس میں تھے۔ ماں باپ کی خوشیوں کا کیا پوچھنا تھا۔

شکور میاں تھے تو باپ کی اولاد، مگر اپنے باپ کی ذرا تو خو بو نہ تھی۔ باپ جھکی ہوئی ڈال تھے، جس سے ملیں گے جھک کے، بیٹے سدا اکڑے اکڑے رہتے۔ عارفہ بیگم کو خالہ بی خالہ بی بولتے تھے۔ اب بچپن سے ہی آنا جانا ہو تو کون پردہ کرتا ہے۔ نہ خالہ بی سے پردہ تھا اور نہ کبھا سے۔ اب تو وہ شہر میں نوکر ہو گئے تھے۔ حکومت کی طرف سے بنگلہ بھی ملا ہوا تھا، کبھی ماں باپ سے ملنے گھر آتے تو خالہ بی سے ملنے چلے آتے تھے۔ کوٹ پتلون اڑائے ہوئے، اونچے پورے وجیہہ شکیل۔ اپنے میں آپ سے جاتے مگر نگاہ نیچے کی اوپر نہ ہوتی۔ کبھی اختر ملنے سے گزرتی تو یوں چھپلتی نظروں سے دیکھ لیتے جیسے بڑا بیگار ٹال رہے ہوں۔ نہ چہرے پہ مسکراہٹ، نہ کوئی ہنسی کی جھلک۔ وہ سلام کرتی تو نظریں چرا کر جواب دیتے:۔

"آداب عرض!" معاملہ ختم۔

بھلا عزیز میاں اور عارفہ بیگم کو پڑی بھی کیا تھی کہ ان کے اس سلوک کا بُرا مانتے۔ ہاں بھئی اگر بیٹی دینے دلانے کا سوال ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ مگر وہ تو بیاہی جیسی تھیں، مگر اب تو عارفہ بیگم کو شکور میاں کے رنگ ڈھنگ کھل کھل جاتے۔ ان کے تو سارے گھرانے کو پتہ تھا کہ بیٹا کی بچپن کی نسبت ختم ہو گئی ہے۔ منحوس تھیں یا مبارک تھیں۔ جیسی بھی تھیں، تھیں تو ان کے محسن کی بیٹی۔ کیا جاتا اگر دولہن بنائے جاتے؟ مگر وہ تو ایسے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔

اس دن بھی، کہ بڑے دنوں کی تعطیل میں گھر آئے ہوئے تھے۔ خالہ بی سے ملنے چلے آئے۔ بیٹھے خالہ بی سے باتیں کر رہے تھے کہ اختر اندر سے پان لئے آئی، دھان پان سا جسم، گوری گوری سی رنگت، آنکھیں کٹیلی چمکتی بجلیاں سی، شاید نہا کر اٹھی تھی کہ بال شانوں سے گر کر ساری پیٹھ پر پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے میں آ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا تو کون جی والا تھا کہ مر نہ مٹتا؟ مگر وہ شکور میاں کہ ایک لمحے کو چونک کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے گھبرا کر یوں نگاہیں ہٹا لیں جیسے اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو نگاہیں جل ہی تو جاتیں۔

یہ ڈھنگ ہوں تو کوئی کیا اس باندھ سکتا ہے؟

بیٹے اگر کسی لڑکی پہ رکھ جائیں اور اڑ کر بیٹھ جائیں کہ "بیاہ کروں گا تو بس اسی سے"

تو ماں باپ لامحالہ ہار جاتے ہیں۔ مگر ماں باپ کسی بیٹی کو پسند کرلیں اور بیٹے کی جان کو آئیں تو بات بالکل نہیں بنتی۔ زندگی تو بیٹے بہو کو گزارنی پڑتی ہے، اگر بنا مرضی گلے میں ڈھول ڈال کر باندھ بھی دیا تو وہ بجائیں گے کاہے؟ کون جانے رحیم بیگ اور ان کی بیوی نے دل ہی دل اختری کو بہو بنانے کے بارے میں سوچا بھی ہو مگر ظہور میاں کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ تو بس خاموش ہی رہیں گے۔

اتنے پر بھی عارفہ بیگم خاموش نہ ہوئیں۔ مانا کہ شہر کی کوئی چربانک دل پر چڑھی بیٹھی ہوگی، مگر پھر بھی شادی ہو جائے گی، دو چار بال بچے ہو جائیں گے تو خود ہی دل بل جائیں گے۔ گھر بھر جاتا ہے تو منہ نہیں پھیرا جاتا۔

پھیر پھیر سے پوچھا بھی، خود ظہیر میاں کے دوستوں نے بھی ٹوہ لگائی، مگر کچھ پتہ ہی نہ چل سکا۔ وہ تو ہونٹ سیے بیٹھے تھے۔ نہ یہ پتہ چلا کہ مرضی ہے یا نہیں، نہ یہ پتہ چلا کہ پھر آخر کس سے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بس منہ سے کچھ پھوٹتے ہی نہیں! عجب کم بخت لوگ ہیں۔

اختری بی کے نصیبوں کا یہ ستارہ بھی ایک جھلک دکھلا کے چمکا اور پھر ڈوب گیا۔

(۵)

بھاوج تو چاہتی تھیں کہ جیسے بنے تیسے نند اس گھر سے ٹلے۔ ان کی چلتی تو کسی بھک منگے کو اُٹھا کر دے ڈالتیں۔ مگر قسمت سے کوئی بھک منگا بھی تو نہ ملتا۔ بھائی جیسے بھی تھے، جو چیز لاتے دونوں کے لئے، چاہے وہ کھانے پینے کی ہو یا اوڑھنے پہننے کی۔ انھیں یہ حصہ داری بھلا یہ کب بھاتی؟

"دو دو بہنیں اپنی عمریں یوں بھائیوں کے گھر بیٹھی بتایا کریں۔

اتنی عمر میں تو ہم نے دو بچے پیدا کر لئے تھے، اور حمل ساقط ہوا وہ الگ۔"

محلے ٹولے میں شادیوں کا موسم آتا تو آئے دن دعوتیں آتیں۔ نہ جائیں تو رشتے ناطے کیسے باقی رہیں؟ ورنہ منہ دور گنائے جائیں، جانا ہی پڑتا، اختری بی پڑھی لکھی، گنوں بھری، اور پھر عزیز میاں زمیندار کی بیٹی، اوپر اور پر چیلی جاتیں۔ گھر والیاں ان کے ذمے میں سارا کام لگا دیتیں۔ دلہن کا سنگھار سی بھی وہی کریں، دال دھیر بھی لوگوں کو وہی بتائیں۔ بیٹیاں کام سے منہ کیسے پھیریں؟ ننھی منی دلہنیں، کوئی بارہ کی، کوئی تیرہ کی، کوئی چودہ کی، کوئی پندرہ کی، کسی کی بہت ہی عمر ہوگی تو سولہ کی۔ حد ہوگئی سترہ۔ یہ جوتوں پر سی کی تہ جاتیں تو کوئی طعنہ دل چھید جاتا۔

"دو دو بہنیں اپنی عمریں یوں بھائیوں کے گھر بیٹھی بتایا کریں!"

سسرال کا چڑھاوا چڑھاتیں، کالی پوت کا لچھا پہناتیں تو سسکنا تیر آتا: —

"یوں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھاتی دینا باقی رہ جاتا ہے۔ کرے بھی کیا بے چاری ۔۔؟"

زمین کے اندر جو بیج سویا ہوا تھا سجاد ح نے پانی ڈال ڈال کر اُگا چھوڑا۔ باہر کس قدر تیز دھوپ تھی! کیسی گھٹن اور تلخ زندگی! (یہ پودے آگاہی کیوں کرتے ہیں کہ فضول تلخ بھری ہواؤں اور جلتے سورج کا سامنا کرنا پڑے!)

(خدا دعائیں نہ سنے، دلی آرزوئیں پوری نہ کرے تو انسان کا یقین ڈگمگا جاتا ہے۔ یہیں ایمان کی آزمائش ہوتی ہے، کفر کا فاصلہ یہاں سے کم رہ جاتا ہے!)

گاؤں کی سرحد سے لگ کر ایک نئی بستی تھی، اُس سے لگ کر کالی مسجد تھی اور کالی مسجد سے لگ کر بڑے پیر کا سفید مزار، کہنے والے کہتے تھے یہاں مانگی گئی ہر مراد پوری ہو جاتی تھی اور خصوصیت سے کنواری بیٹیوں کی ماؤں نے جب بھی پریشان ہو کر بروں کی دعا مانگی۔ دیر سویر اُن کے بھلے بر جڑ ہی گئے۔ اتنے اونچے سارے مزار کی اب مجاور رکھوالی کرتا تھا۔ نیاز نذر بھی وہی قبول کرتا تھا۔

اس دن عارفہ بیگم نے بیٹی کے ہاتھ میں چوڑیاں لا کر پہنائیں تو اختر کا جی ڈوب سا گیا۔ دل خون ہو کر جیسے بہہ نکلا۔

"اماں یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟"

ماں نے بیٹی ہی سے راز چھپانا چاہا "ایسے ہی منیاری والے کے پاس اچھی چوڑیاں نظر آئیں تو تیرے لئے لے آئی۔"

مگر وہ مزار کی ہری باریک چوڑی سب سے الگ نمایاں نظر آ رہی تھی اور اختر کا منہ دیکھ کر جیسے منہ بسور کر بول اٹھی :۔

"نہیں نہیں، مجھے تو تمہاری اماں منت مان کر مزار سے لائی ہیں۔ میں ان مانگوں کی بہن لگتی ہوں؟ میں تو تمہارے سہاگ کی مسرت ہوں۔ مجھے توڑو نہیں۔ مجھے ٹھکراؤ نہیں"

اختر نے بے بسی سے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔

"اماں خدا کو نہ بھولئے، وہی سب سے بڑا سہارا ہے، وہی دلوں کی مرادیں پوری کرنے والا ہے۔"

گھٹنوں میں دھنسا ہوا سر رہ رہ کر کانپتا رہا۔

کوئی دو چار دن بھی نہ گزرے ہوں گے، عارفہ بیگم چوڑی کی کرامت کی منتظر ہی تھیں کہ اس دن ان کو اکو ماں کے ہاتھ ٹوٹے نظر آئے۔

ان کا جی دھک سے رہ گیا۔

"چوڑیاں کیا ہوئیں بیٹیا؟" انھوں نے آنسو پیتے ہوئے کہا

"حمام میں ٹھوکر لگی اور ساری کرچی کرچی ہو گئیں۔ دو ایک باقی رہ گئیں تو میں نے آپ ہی پھوڑ ڈالیں۔" وہ صاف جھوٹ بول گئی

"ہائے بیٹی ان میں تیرے سہاگ کی چوڑی بھی تھی۔" انھوں نے چلاّ کر کہنا چاہا مگر آواز وہیں کہیں دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔

"منت ماننے سے سہاگ نہیں مل کرتا اماں۔ سب قسمت کی بات ہے۔" اس نے رو کر کہنا چاہا مگر آنسوؤں نے گلا پکڑ لیا۔

"سب قسمت کی بات ہے۔ سب قسمت کی بات ہے!"

(۶)

عید پر پندرہ دنوں کی رخصت لے کے شکور میاں گھر آئے ہوئے تھے۔ عید سے پہلے خالہ بی سے ملنے آئے، خالہ بی کے دل میں چاند سا چمکا۔ "یہ بار بار میرے گھر کے پھیرے کیوں کرتا ہے؟" اختر باہر آئی تو شکور میاں نے سہم کر اور پھر چونک کر یوں جلدی سے نگاہیں ہٹا لیں کہ اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو وہ نگاہیں وہیں جل کر رہ جائیں۔

نفرت کا وہی پرانا انداز! خالہ بی کے دل کا چاند وہیں ڈوب گیا۔

"حیا، مروت بھی کوئی چیز ہے۔ خلوص، محبت، انسانیت تو دنیا سے اٹھ ہی گئی۔ بھلا یہ شکور میاں اختر ایسی بیٹی کو کر لیں تو کیا برائی ہے؟ اختر ایسی دلہن سے تو گھر بھر میں جھما جھم آ جائے بھر جائیں۔ مگر کرے کون؟" انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔

ایک دن صبح اکو ماں ناشتہ کرتے کرتے بولی:۔

"اماں رات میں نے بڑا عجیب سا خواب دیکھا۔"

"کیا؟" اماں نے لاپرواہی سے پوچھا۔

"نہیں اماں مجھے ایسا لگا کہ آپ اور میں۔ وہ کالی مسجد کے ساتھ والا اونچا سا مزار ہے نا، وہاں کھڑی ہیں، بس دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے دھکا دے کر مجھے ندی میں دھکیل دیا۔" اس نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

اماں چونکیں اور چلا کر پوچھا:۔ "میں نے؟"

اختر نے سکون سے جواب دیا۔ "ہاں اماں آپ نے"

عارفہ بیگم ہنسنے لگیں۔ "واہ ری لڑکی! خواب بھی کیا دیکھا تھا۔ سیدھی کروٹ سویا کر۔"

دوسرے دن ناشتے پر اختر ماں سے بولی:۔

"اماں رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا جیسے میں اور آپ مزار کے اونچے چبوترے پر کھڑی ہیں اور ایک دم آپ نے دھکا دے کر لوٹ دیا۔" وہ رکی اور ماں کو دیکھتی ہوئی بولی، "اور اماں میں چلا رہی ہوں، میں مرنا نہیں چاہتی۔ اماں مجھے دھکا نہ دیجئے، مگر آپ نے ایک نہ سنی اور بولیں:۔

"تیرا مرنا ہی ٹھیک ہے لاڈو، مجھے لوٹ دیا، جانے کیسا خواب ہے!" اس نے ماں کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔

"روز روز وہی خواب دیکھتی ہے۔ دماغ کی کمزوری ہے ساری!" انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

اب عارفہ بیگم سدا ئی ادھیڑ بن میں دکھائی دیتیں۔ اختر دیکھتی کبھی ماں اپنی مٹھیاں بند کر رہی ہیں، کبھی کھول رہی ہیں، کبھی اپنے آپ میں ہنس رہی ہیں، کبھی آنکھیں پونچھنے لگتی ہے۔ کبھی خود سے باتیں کرنے لگتی ہیں:۔

"نہیں نہیں یہ کیسے ممکن ہے؟" پھر خود ہی جواب دیتیں:۔

"اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟"

ان ہی دنوں گاؤں میں جو بڑے زمیندار خلیل میاں تھے، ان کی بیوی کا یکایک انتقال ہو گیا۔ مرنے والی اپنے پیچھے ایک کنبہ چھوڑ مریں:۔ جوان بیٹیاں، جوان بیٹے، پوتے، پوتیاں، بہوئیں۔ خلیل خاں کا اتنا بڑا کاروبار، اتنی بڑی زمینداری تھی، مگر بھی خوب بڑا سارا۔ کھانے والے اتنے تھے، بغیر گھر والے کے یہ بھی چل سکتا ہے۔ ظہیر میاں ان کے یہاں نوکری تو کرتے ہی تھے، خلیل خاں کو رنڈوا دیکھ کر اپنی بہن کا خیال آ گیا۔

"اگر آپ کہیں تو یہ رشتہ ہو سکتا ہے۔ ہاں بس یہ بات ہے کہ وہ ذرا بوڑھے ہیں" وہ ماں سے بولے

"ذرا بوڑھے ہیں؟" بھنا عارفہ بیگم چلائیں، "تمہارے باپ ان کی جوانی میں گھٹنے برابر کے تھے۔ اچھا جوڑا ڈھونڈا ہے میاں تو نے اپنی بہن کا۔ سہاگ اور رنڈاپا ساتھ ہی ساتھ کیوں نہیں چڑھا دیتا۔ ایسی جگہ بیاہنے سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنویں میں ڈال دو اس کو"

ایک دم اُن کے ہونٹ کانپ اٹھے، دل دھڑک اٹھا۔

"اور ماں میں نے دیکھا کہ آپ اور میں اس چبوترے پر کھڑی ہیں اور ایک دم آپ نے مجھے

لوٹ دیا۔

ان کے دماغ پر دھیرے دھیرے اختر کا خواب چھانے لگا جو وہ مسلسل تین دنوں تک دیکھتی رہی تھی۔ "اس سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنوئیں میں ڈال دو اس کو۔"

"اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ نے مجھے دھکا دے کر......"

ان کا دل دھڑ دھڑ کر اٹھا۔ دھک... دھک۔ تیز تیز دھڑکن۔ دھڑ... دھڑ... دھڑ۔ دھڑ... پھر دھیمی دھیمی رفتار سے دھڑکتے ان کا دل جیسے مطمئن ہو گیا۔

جمعرات کے دن صبح ہی صبح، کہ ابھی تارے چھٹکے ہوئے ہی تھے، حامدہ بیگم نے اختر کو جگا دیا۔

"بیٹی۔ او بٹیا۔ اٹھو ماں۔"

"اوں۔ اوں۔ جی۔" وہ کسمسا کر پھر سو گئی۔

"بیٹی اٹھو تو سہی۔ ذرا کالی مسجد تک چلیں گے۔"

"جی۔ کیا!" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"پیر صاحب کے مزار تک چلیں گے۔" وہ سکون سے بولیں۔

"کیوں؟" اس نے چھوٹا سا سوال کیا

"نہیں بیٹا۔ رجب علی کی بیوی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ جمعرات کو منہ اندھیرے مانی گئی منت بالکل پوری ہو جاتی ہے۔ چل آج یوں ہی قسمت آزماتے ہیں۔"

"آپ کو ایسی کون سی منت ماننی ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"دل کا سکون بھی بڑی چیز ہے بیٹی۔ میں یہ آج یہ منت ماننے والی ہوں کہ خدا تو میرے دل کو اطمینان دے، سکون دے۔"

"اچھا چلئے۔" وہ جوتیاں ٹٹولتی ہوئی بولی، "ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔"

ترل۔ ترل۔ ترل۔ نیچے ندی کا پانی بہہ رہا تھا۔ ہرا ہرا سا، نیلا نیلا سا، صاف شفاف پانی۔ مزار کے سب سے اونچے چبوترے پر حامدہ بیگم اور اختر کھڑی تھیں۔

"بہت سوں سے سنا ہے اندھیرے وقت صبح ہی صبح مانی گئی منت پوری ہو جاتی ہے۔ اور پھر آج جمعرات بھی ہے۔" انہوں نے سسکتے لہجے میں کہا۔

نیچے پانی بہہ رہا تھا اوپر وہ دونوں کھڑی تھیں۔

اختر نے ماں کو دیکھا۔ ان کا چہرہ بے جان بے جان سا اور سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ "اماں آپ اس قدر پیلی کیوں نظر آ رہی ہیں؟" اس نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہیں! میرا چہرہ! نہیں تو!" وہ چونک کر زور سے ہنسنے لگیں "تاروں کی روشنی میں پیلا نظر آرہا ہوگا اور بیٹا تھک تو رہے ہو..... وہ سنجیدہ ہوگئیں، کہ ادھر جب سے تمہارے باپ کا انتقال ہوا ہے دن رات روتے روتے اور فکریں اُٹھاتے اُٹھاتے میرا خون سوکھ گیا ہے۔ اور خون سوکھ جائے تو انسان پیلا نظر آئے تو کیا ہو؟" وہ ذرا سا مسکرائیں۔ ان کی مسکراہٹ میں عجیب غیر یقینی انداز تھا۔

اختر نے بڑے سکون سے جواب دیا: "فکروں پر جی جلانے کی کیا بات ہے اماں! سوچنے سے فکریں کچھ کم تھوڑی ہی ہو جاتی ہیں۔ آپ خواہ مخواہ خود کو کڑھاتی رہتی ہیں"

"ہاں میں خود کو خواہ مخواہ کڑھاتی رہتی ہوں" وہ نیچے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر بولیں۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولیں: "مگر میں آج خلوص دل سے دعا مانگنے آئی ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ آج میرے دل کو دائمی سکون مل جائے گا"۔

انہوں نے بے جان ہاتھوں سے پاس کھڑی اختر کو اپنی طرف کھینچا۔ ایک خوفناک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پہ چھا گئی اور انہوں نے اختر کو پوری طاقت سے نیچے کی طرف لوٹ دیا!

اختر کا پھول پان سا جسم پانی میں قلابازی کھا گیا۔ کچھ دور پر اس کا سر ابھرا، سیاہ بالوں میں چاند ایسا چہرہ چمکا اور ڈوب گیا۔ تھوڑی دور پر پھر اس کا سر ابھرا، پھر ڈوبا، پھر ابھرا، ڈوبا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عارفہ بیگم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور ہونٹ بھیلے ہوئے۔ یوں کھڑے کھڑے ایک صدی اُن کے سر پر سے گزر گئی۔ مردوں کی طرح وہ اندھیری سیڑھیوں پر سے اترنے لگیں کہ اک دم کسی سے ٹکرا گئیں۔

آنے والا کوئی مرد تھا۔

"ارے آپ؟ خالہ بی! یہاں ــ!" وہ پہچان گیا۔ اک دم وہ خالہ بی کو اُجالے میں لے آیا اور بڑی بے بسی سے گھبرا کر بولنے لگا:۔

"خالہ بی، جانے کس نے مجھ سے بتایا تھا کہ جمعرات کی صبح مانگی گئی منتیں قبول ہو جاتی ہیں۔ ہر بار جب گاؤں آتا ہوں تب ماتھا رگڑ رگڑ کر دعائیں مانگتا ہوں، مزار پر آکر منتیں مانتا ہوں، مگر خالہ بی! ـــ مگر ـ آپ سن رہی ہیں نا؟ مگر کبھی میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ میں زمین پہ رہنے والا ذرہ آسمان پہ چمکنے والے ستارے کی آرزو کرتا ہوں خالہ بی۔ مگر کس منہ سے کہوں کہ میں اختر سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟ ـ میں تو آپ کے گھر کا پروردہ ہوں۔ بھلا آپ لوگ کیا سوچیں گے۔ ڈر کے مارے کبھی ابا اماں کے سامنے اشارۃً بھی نہ کہا کہ وہ اک دم میرا دل نہ توڑ دیں۔

بن دل ہی دل میں اپنی محبت کا درد چھپائے رہا۔ اپنی حیثیت خوب جانتا ہوں خالہ بی، اس لئے کبھی اختر کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں کہ جس چیز کو میں حاصل نہیں کر سکتا اس کی تمنا کیوں کروں کیوں اس ناممکن سی بات کی آرزو کروں؟ مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا خالہ بی۔۔۔۔ آج آپ کو اکیلا پا کر میری ہمت بندھ گئی۔ میں غریب مزدور ہوں خالہ بی، آپ لوگوں کی برابری کا دعویٰ نہیں، مگر آپ یقین مانیے میں اختر کو بہت خوش رکھوں گا، بہت اچھی طرح رکھوں گا۔ آج جمعرات ہے شاید میری دعا قبول ہو جائے!" اس نے کندھا پکڑ کر خالہ بی کو ہلا دیا۔

"میں آپ سے بھیک مانگ رہا ہوں خالہ بی، مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹائیے۔ یقین کیجیے میں اختر کے بغیر مر جاؤں گا۔ ہاں کر دیجیے خالہ بی۔"

خالہ بی کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ وسیع ہو گئی اور ان کے خوفناک قہقہے سنسان مزار کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر بری طرح شور مچانے لگے۔

* * *

www.taeneernews.com

عیدی

میرے گلے میں ایک بے حد خوب صورت لاکٹ جھولتا رہتا تھا۔ دل کی وضع کا سونے کا یہ لاکٹ کتنوں ہی کی توجہ اپنی طرف کھینچ چکا ہے ۔۔۔ سکھی سہیلیاں مجھ سے چھیڑ سے پوچھتی ہیں۔ "یہ کیا اپنے پریتم کی تصویر اس میں چھپا رکھی ہے جو کبھی گلے سے الگ ہی نہیں کرتی ۔۔۔"

میں مسکرا کر رہ جاتی ہوں ۔۔۔ ایک غم ناک سی مسکراہٹ۔ کیا لاکٹوں میں صرف پریتم کی تصویریں چھپائی جاتی ہیں؟ یہ کوئی ایسا راز تو نہیں جسے میں زمانے بھر کی نگاہ سے چھپاتی پھروں ۔۔۔ لیکن میں اکثر یہ سوچ کر رہ گئی ہوں کہ اگر میں نے یہ بتا دیا کہ اس لاکٹ میں میں نے کیا سنجا رکھا ہے تو کیا سننے والے واقعی یقین کر لیں گے؟

آج عید کا دن ہے ۔۔۔ پتہ نہیں اس دن میں کیا خاص بات ہوتی ہے کہ بھولے بسرے پرانے چہرے بھی یوں رہ رہ کر یاد آتے ہیں کہ دل کلپ کلپ جاتا ہے۔ میری یادوں کے اُفق پر ایک چہرہ عید کے دن خاص طور سے جگمگاتا ہے ۔۔۔ یوں جیسے وہ چہرہ نہ ہو، چاند ہو جس کی جگمگاہٹ سے دل کا کونا کونا روشن ہو جاتا ہے۔ یہ میری دادی بی کا چہرہ ہے ۔۔۔ محبت کی شعاعوں سے دمکتا ہوا۔ پیار میں ڈوبا ہوا ۔۔۔

ترخشانہ

برسوں پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں جب شاید میں چھ سات برس کی ننھی سی معصوم اور نادان بچی تھی، اس سال عید ہمارے لئے محرم بن کر آئی تھی۔ اس لئے کہ عید سے چند روز پہلے ہماری امی چل بسی تھیں۔ عید کے دن جو چہل پہل اور خوشی ہوتی ہے اس کا دور دور پتہ نہ تھا۔ بس ایسا لگتا ہے ابھی ابھی کوئی میت اُٹھائی گئی ہے۔ نانی اماں کا اس دن روتے روتے بُرا حال تھا۔ ہمیں نہ عید کے اہتمام میں نئے کپڑے پہنائے گئے، نہ گھر میں اچھے اچھے پکوان پکے، جب محلے ٹولے کے سارے بچے رنگ برنگ کے کپڑے پہن کر ادھر اُدھر اُچھل پھاند مچانے لگے۔ اس وقت اچانک اس جان لیوا حقیقت کا انکشاف ہوا کہ آج ہمارے گھر عید نہیں آئی ہے —— جب ہم نے نانی سے ضد کرنا شروع کی کہ ہم بھی نئے کپڑے پہنیں گے۔ ہم بھی میٹھا کھائیں گے تو نانی اماں نے نوکر کو بلا کر ہدایت کی کہ ان بچوں کو راحت بوا کے ہاں چھوڑ آ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

نوکر نے ہماری انگلیاں پکڑیں، اور ہمیں ایک صاف ستھرے لپے پُتے چھوٹے سے گھر میں چھوڑ آیا —— وہیں میں نے پہلی بار محبت سے بھرپور ایک چہرہ دیکھا۔ وہ نانی اماں کی سہیلی راحت بوا تھیں اور ہماری دادی بی، اُنھوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور گلے سے لگاتے ہی اُن کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں —— آج اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی، آنسوؤں نے اس کا گلا دبوچ لیا اور وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگیں —— ہم حیرت سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ ہماری امی کے لیے یوں دھاروں دھار رونے والی یہ مہربان ہستی کون ہے ؟ —— پھر اُنھوں نے سنبھل کر ہماری سہمی ہوئی صورتوں کو دیکھا اور بڑے پیار سے غسل خانے میں لے گئیں۔ منہ ہاتھ دھلوا کر اُنھوں نے بے حد پیار سے میرے سر میں تیل ڈالا اور چوٹیاں گوندھنے بیٹھ گئیں —— جب بھیا کی اور میری ہولی صورتیں سج سنور گئیں تو اُنھوں نے بے حد پیار سے دسترخوان بچھایا اور کئی طرح کے کھانے لاکر چن دیے۔ وہ منہ میں نوالے دے دے کر سر پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر ہمیں کھانا کھلاتی رہیں اور جب نیند سے ہماری آنکھیں مُندنے لگیں تو اُنھوں نے کھلے برآمدے میں ہوا کے رُخ پر ایک صاف ستھرا بستر بچھایا اور ہم دونوں بہن بھائیوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔

کوئی تین چار بجے کے قریب ہم اُٹھے۔ انھوں نے پھر سے منہ ہاتھ دُھلوا کر

زمیں محبت سے سنوارا اور دھوپ ڈھلے جب ہم گھر چلنے کو ہوئے تو انہوں نے دروازے تک ہمیں لا کر چھوڑا ۔۔ اور جانے سے پہلے پہلے اپنی کمر میں اڑسی ہوئی ایک بوسیدہ سی تھیلی نکالی اور بے حد پیار سے ہماری مٹھیاں کھلوا کر اس میں ایک ایک چونی رکھی اور بولیں ۔ "یہ تمہاری عیدی ہے بچو ۔"

میں نے بے حد غیر یقینی انداز سے پہلے اپنی مٹھی میں رکھی ہوئی چونی کی طرف دیکھا اور پھر دادی بی کی طرف پہلی بار شاید میرے ہونٹ کھلے ۔ "یہ ۔۔ یہ ، یہ میری ہے ۔۔ ؟"

"ہاں بیٹی بالکل تیری ہے ۔" پھر وہ بے حد پیار سے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولیں ۔ "اچھا یہ بتا تو اپنی نانی اماں سے تو نہیں کہہ دے گی کہ میں نے تجھے چونی دی ہے ۔"

"بالکل نہیں ۔۔" میں نے مٹھی کو مضبوطی سے بند کرتے ہوئے کہا ۔ دادی بی جانتی تھیں کہ نانی اماں ان معاملوں میں حد درجہ سخت واقع ہوئی ہیں وہ اس بات کی مطلق روادار نہ تھیں کہ ہم کسی سے ایک پائی بھی لیں ۔ بھلے سے وہ عیدی کے نام ہی کیوں نہ ہو ۔ جب دادی بی مطمئن ہو گئیں تو انہوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا ۔ "اچھا بی بی یہ بتا تو ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی ۔"

یہ سوال مجھے گڑبڑا گیا ۔۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ نانی اماں نوکر کے ہاتھ میں دو آنے دے کر ڈھیروں سودا لانے کو کہا کرتی تھیں اور وہ زمانہ اس قدر سستے کا زمانہ تھا کہ تھیلا بھر سودا لانے کے باوجود بھی نوکر دو تین پیسے نانی اماں کے ہاتھ میں واپس تھما دیا کرتا تھا ۔۔ چار آنے میں تو ایک دنیا آ سکتی تھی ۔ اگر گڑیا کا بیاہ ہی رچانے بیٹھ جاؤں تو ڈھیروں چاول شکر ، گھی ، میوے ، پھر گوشت سبزیاں ، کیا کیا نہ خرید سکوں گی ۔ پوری بارات کھانا کھا کر اٹھ جائے گی تب بھی چیزیں باقی بچ جائیں گی میری سمجھ میں قطعی نہیں آ رہا تھا کہ آخر میں اس خزانے کو کس طرح خرچ کر پاؤں گی ۔ بس جی چاہ رہا تھا جلد سے جلد دادی بی کے چنگل سے نکل بھاگوں اور جس طرح بن پڑے اس دولت کو ٹھکانے لگا دوں ۔۔ اس خیال کے آتے ہی پہلے تو میں نے کچھ شک و شبہ سے دادی بی کے چہرے کو دیکھا اور پھر تیزی سے مٹھی بند کر کے چوکھٹ سے اک دم باہر جا گی ۔ مجھے اپنے پیچھے دادی بی کی محبت اور ہنسی سے بھری ہوئی آواز سنائی دی ، "ڈرتی ہے کہ کوئی اس کی رقم ہتھیا نہ لے ۔۔"

اور یہ حقیقت بھی تھی۔

گھر آنے پر میں اور نئے نئے وسوسوں میں اُلجھ گئی۔ آخر میں کس طرح یہ رقم خرچ کر سکتی تھی؟

یوں نہیں ــــ میں نے سوچا گھر سے ملی ہوئی جو دُکان ہے وہیں چل کر سوچتے ہیں، اچھی اچھی چیزیں دیکھ کر خود ہی سوجھ جائے گا کہ کیا لیا جائے، کیا نہ لیا جائے۔

دوسرے دن جب نانی اماں اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ میں آنکھ بچا کر گھر سے نکلی اور سیدھی کونے والی دُکان پر جا پہنچی ــــ ایک انگلی دانتوں تلے دبائے میں بڑی دیر تک محویت کے عالم میں دُکان کا جائزہ لیتی رہی ــــ کئی گاہکوں سے نمٹنے کے بعد آخر دُکان دار مجھ سے مخاطب ہوا، "تمہیں کیا چاہئے بی بی ــــ؟"

میں بڑبڑا سی گئی، "وہ ــــ وہ کونے میں جو گڑیا ہے وہ چاہئے"

دُکان دار نے گڑیا نکال کر سامنے رکھ دی اور پھر پوچھا "اور کیا چاہئے ــ؟"

"اور گڑیا کے گلے کے لئے مالا ــــ موتیوں والی ــــ"

"چلئے یہ قصہ بھی تمام ہوا۔" دُکان دار خوش دلی سے مسکرایا۔

"اب بتائیے"

"کاجو"

"اور ــــ؟"

"وہ کھٹی میٹھی گولیاں"

"اور ــــ؟"

میں نے جھجک کر کہا "رنگین پنسل"

"اور"

میں نے کچھ غیر یقینی نگاہوں سے سامان کے ڈھیر کو تاکا ــــ اتنا کچھ خرید لیا اور یہ دُکاندار ابھی تک اور ــــ اور کئے جا رہا ہے۔ میں نے مطمئن ہو کر کہہ دیا "اب بس ــــ"

دُکاندار نے سامان کا بنڈل بنا کر میرے ہاتھوں میں تھمایا اور ساتھ ہی بچے ہوئے چھ پیسے بھی میرے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ دادی بی کیوں پوچھ رہی تھیں کہ بتا بی بی تو ان چار آنوں میں

کیا کیا خریدے گی ــــ تو کیا دادی بی نے واقعی اس قدر رقم حوالے کر دی تھی ــــ ؟ ایک دم سے دادی بی مجھے قصّے کہانیوں والی مہربان پری لگیں جو خوش ہو کر جو جی میں آتا بخش دیا کر

میں خوشی سے ساری بیہودی گھر لوٹی ــــ سامنے ہی نانی اماں کھڑی مرغیوں کو ملنہ ڈال رہی تھیں۔ میرے پاؤں ٹھٹک گئے ــــ اب تو خوب پٹائی ہوگی۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سارا قصہ سُننے کے بعد نانی اماں کی آنکھیں خود بھی آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں ــ "بڑی نیک بخت بی بی ہے ــ خدا دونوں جہاں میں اس کی نیکیوں کا صلہ دے۔ گوشت پوست سے نہیں محبت سے بنی ہوئی عورت ہے راحت بیا ــ"

نانی اماں کے ان الفاظ سے میرے دل میں دادی بی کی محبت اور قدر دُگنی چوگنی ہو گئی ۔

اگلی عید پر بھی ہم دادی بی سے ملنے گئے۔ وہ اُسی تپاک سے ملیں جیسے سال بھر ملتی رہتی تھیں۔ اور اس عید پر بھی اُنہوں نے وداع کرتے ہوئے اپنی بوسیدہ سی تھیلی میں سے چونّی نکال کر دی اور اسی رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

" بتا بی بی ان چار آنوں میں تو کیا کیا خریدے گی ــ ؟ "

⁂ ⁂ ⁂

کتنے سال ایک ایک کر کے یوں ہی گزر گئے ۔ زمانے کے انداز بدلتے رہے مہنگائی بڑھتی رہی ــــ پھر جنگیں ہوئی۔ دنیا کے نقشے بدلے ــــ ہندوستان پاکستان آزاد ہوئے ۔ ایک نئی دنیا کی داغ بیل پڑی اور ہم بھی اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر پردیس میں آ بسے۔ اب تک زندگی میں کوئی لمحہ خوشی کا میسّر نہ آیا تھا۔ وہی غربت، وہی تنگی ــ وہی حالات، ــ سوچا تھا کہ نئی جگہ شاید نیا آب و دانہ بدلے گا، لیکن قسمتیں بھی کبھی بدلا کرتی ہیں ؟ پردیس آکر مصیبتوں کی داستان اور بھی دردناک اور طویل ہو گئی ۔ عید آتی تو اور بھی یاد آتا کہ کس طرح دادی بی چار آنے دیا کرتی تھیں جو ایک مدت کی خوشی کا سامان ہو جاتے تھے۔ پردیس آکر اس دولت سے بھی محرومی ہو گئی ۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

پھر کچھ سال اور گزر گئے ــــ اور زمانہ اس تیز رفتاری سے بدلا اور مہنگائی بڑھی

بڑھی کر چار آنے تو کیا چار روپے بھی حقیر رقم معلوم ہونے لگی۔ بچپن میں سال بھر عید کا انتظار واقعی عید کی طرح رہتا تھا۔ اب عید آتی تو سادے دن کی طرح یوں ہی گزر جاتی ــــ لیکن یہ ضرور تھا کہ کسی بھی عید کو دادی بی کی یاد نے ساتھ نہ چھوڑا۔

وقت نے ایک اور بھرپور انگڑائی لی اور میری شادی ہو گئی۔ گویا زندگی بھر کی تمام کلفتوں مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا ــــ یہ یقین پختہ تر ہو گیا کہ خدا مصیبت کے بعد راحت اور خزاں کے بعد بہار ضرور دیتا ہے۔ میرے شوہر بڑے بزنس مین تھے۔ روپے پیسے کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔ جنت کا ہمارے ذہنوں میں یہی تصور ہے نا کہ جس چیز کی تمنا کرو آموجود ہوتی ہے۔ تو مجھے جیتے جی گویا جنت مل گئی تھی۔ پھر جب خدا نے اس چمن میں ایک خوشگفتہ کلی اور پھر ایک پھول بھی کھلا دیا تو زندگی سچ سچ ہی بہار بن اور جنت کا حقیقی روپ ہو گئی۔

دنیاوی تھی ــــ یقیناً دنیا کی مشکلات بھی دیکھی ہوں گی۔ لیکن میرا یہ حال تھا کہ کبھی ایک گاڑی ایک سال استعمال کر لی اور اس سے جی بھر گیا تو یوں نئی خرید لی جیسے بیس ہزار کی نہ ہو بیس روپے کی بات ہو۔ شہر اور میدان میں رہتے رہتے جی اوب گیا تو پہاڑوں پر گرمیاں گزارنے چلی گئی۔ تقریباً ہر ہل اسٹیشن پر ذاتی گھر انہوں نے خرید رکھے تھے اور ویسے بھی رہنے کے لئے بمبئی جیسے شہر میں اتنی بڑی کوٹھی تھی کہ چلتے چلتے جاؤ مگر کوٹھی ختم نہ ہو۔ اب عید آتی تو ان ہنگاموں کے ساتھ کی خریداری شروع ہوتی تو ختم ہونے ہی میں نہ آتی اور گھر یوں بھر جاتا کہ لگتا کہ دکانیں کی دکانیں گھر میں لا ڈالی ہیں۔

اسی طرح چند سال اور گزرے اور پھر اچانک ایک موقع ایسا آیا کہ مجھے برسوں بعد وطن عزیز میں عید منانے کا موقع ملا ــــ جب ہم اپنے آبائی مکان میں اترے تو ایسا لگتا تھا کہ یہ گھر نہیں روحوں کا ویران مسکن ہے۔ محلے ٹولے کے پرانے لوگ جانے کدھر جا بسے تھے۔ نئے دسے کہ گھر میں ایک پرانے وقتوں کا بوڑھا مالی رہ گیا تھا جو سر شام ہی ننھا سا میلا دیا جلا کر راہداری والے طاقچے میں رکھ دیتا ــــ پرانے دن پرانی باتیں گزری ہوئی گھڑیاں یاد آ آ کر دل کو جیسے مسوسنے لگیں۔ شہر ہوٹلوں اور بڑے بڑے ریسٹورانوں سے بھرا پڑا تھا ــــ یہ کیا ضرور تھا کہ ہم اسی مزار جیسی ویران حویلی میں عید مناتے لیکن میں نے سوچا پرانی یادوں کو تازہ کر لینے میں کیا حرج ہے۔

عیدی

جب وہ عید کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میں سراپا بہار بنی کھڑی تھی۔

"اوہ — یہ ٹھاٹھ ہیں!" انہوں نے پیار سے چھیڑا۔ "قیامت نظر آرہی ہو — کہاں کی تیاری ہے — ؟"

میں نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی — یہ ساڑی گیارہ سو میں انہوں نے خاص طور سے مجھے عید پر پہننے کے لئے دلائی تھی — یوں چمکتی جگمگاتی مانو آگ لگی ہے۔ کانوں میں ہیروں کے دمکتے ہوئے لانبے جھمکے۔ ہاتھوں میں ساڑی سے میل کھاتی ہوئی اصلی زمرد کی چوڑیاں۔ گلے میں جڑاؤ ہار، ناک میں تارے کی طرح جگ مگ کرتی ننھی سی لونگ۔ میں دلہنوں کی طرح بھرپور انگشتریاں اور پیروں میں نازک نازک چپلیاں جو سونے کے تاروں کی بنی ہوئی تھیں۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور ہنس کر بولی "تیاری؟ ہاں تیاری ہے تو سہی اور ایک بہت اہم ہستی سے ملنے کی ہے۔"

"ذرا ہم بھی اس خوش نصیب کا نام سنیں" وہ شرارت سے بولے۔

میں بچوں کی سی معصوم خوشی سے بولی۔ "آپ سن بھی لیں تو اس کی اہمیت کو نہ سمجھ پائیں گے" پھر قدرے رک کر بولی "وہ میری دادی بی ہیں۔"

"تمہاری دادی بی —؟" وہ حیرت سے بولے — "مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہاری دادی بی کے انتقال کو تو ایک مدت ہو چکی ہے۔"

"ہاں لیکن یہ دادی بی سدا میری رگِ جاں سے بھی قریب رہی ہیں۔ آپ ملیں تو سہی پھر کہیے گا کہ ایسی محبت والی ہستیاں صرف کتابوں میں ہی ہوں تو ہوں — اس دنیا میں تو مثال ناممکن ہے۔"

انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بنا کچھ کہے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

ہماری لمبی کار زن کرکے ایک بوسیدہ سے مکان کے پاس سے گزری اور میں نے ذرا چلا کر کہا۔ "بس بس..... روک دیجئے.... یہ میری دادی بی کا گھر ہے" — کار ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور کار کے رکتے ہی بہت سارے بچے بھی وہاں آکر کھڑے ہو گئے اور حیرت سے گردنیں اونچی کرکے دیکھنے لگے۔

میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی ایسا لگا کہ کسی محل سے نکل کر ماچس کی ڈبیا میں بند ہو گئی ہوں۔ ایک پرانی سی بو نے میرا استقبال کیا اور ہلکے ہلکے اندھیرے سے جب میری آنکھیں مانوس ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ کونے میں ایک مڑی تڑی گٹھری سی پڑی ہے۔

"کون ہے ۔۔۔ ؟" پاؤں کی چاپ سن کر ایک کمزوری آواز نے سر اٹھایا۔

"ارے یہ دادی بی ہیں" میں نے دکھے دل سے سوچا۔ بڑی ہمت جمع کر کے آواز نکالی "دادی بی میں ہوں ۔۔۔ آپ کی بی بی"

یوں جیسے ذہن پر زور ڈال کر انہوں نے سوچنا شروع کیا ہو ۔۔۔ پھر خوشی سے لرزتی آواز میں انہوں نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے ۔۔۔ "ارے بی بی تو ۔۔۔ ؟ آمنہ بوا کی نواسی ہے نا تو ۔۔۔ ؟" گویا انہوں نے یقین کر لینا چاہا ہو۔

"ہاں دادی بی میں ہوں نا ۔۔۔ آپ مجھے بھول گئیں"

شرمندگی کے ہلکے سے غبار میں لپٹی اور دکھ میں ڈوبی آواز میں وہ بولیں۔

"نہیں بی بی تو کوئی بھولنے جیسی چیز ہے۔ مگر برس بھی کتنے گزر گئے۔ کم بخت آنکھیں بھی تو جاتی رہیں ۔۔۔"

میرے دل پر ایک گھونسہ سا پڑا ۔۔۔ میں سہم کر بولی "دادی بی آپ کو نظر نہیں آتا ۔۔۔ ؟"

"نہیں بی بی ۔۔۔ بس اب تو آنکھوں کے آگے مستقل رات کا سا منظر ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے ۔۔۔ وہ ذرا ہنس کر بولیں ۔۔۔ "اور بی بی اب دنیا میں دیکھنے کے لئے رہ بھی کیا گیا ہے۔ اپنے بیگانے ایک ایک کر کے سارے مر کھپ گئے یا پاکستان چلے گئے مگر اتنے دنوں میں آج دل چاہ رہا ہے کہ آنکھیں ہوتیں تو اپنی بی بی کو ایک نظر دیکھ تو لیتی۔

تیری شادی وادی ہو گئی یا نہیں بی بی ۔۔۔ ؟ وہ محبت سے پوچھ رہی تھیں۔

دکھ اور شرم سے بوجھل آواز سے میں بولی۔ "جی ہاں دادی بی ۔۔۔ ہو گئی ہے"

"بچے وچے ہیں ۔۔۔ ؟"

"ایک لڑکا ایک لڑکی ہے۔"

"ساتھ نہیں لائی"

نہیں بی — بمبئی میں گھر پر ہی ہیں۔"

"چلو اچھا ہوا" وہ سکھ کی سانس لے کر بولیں۔ "بن ماں کی بچی تھی ٹھکانے سے بیٹھ گئی —" ایک دم جیسے انہیں کچھ یاد آیا — وہ مجھے ہاتھوں سے ڈھونڈتی ہوئی بولیں — "پر میرے لئے تو تو ابھی بھی بچی ہی ہے۔ اب تو کچھ سوجھتا بھی نہیں ورنہ تیری کنگھی تو بھی کر دیتی — آج عید کا دن ہے نا — ہر عید کو میں تیرے بال سنوارا کرتی تھی۔ یاد ہے نا —"

میں نے گردن سے اونچائی پر بندھے اپنے بڑے سے جوڑے کو محسوس کیا جس میں چھپا کرن کا سونے اور موتیوں کا کلپ جگ مگ کر رہا تھا اور سہم کر بولی۔ "دادی بی اب تو میں بہت بڑی ہو چکی ہوں۔"

"ہاں بی بی پر میرے لئے تو تو آج بھی وہی ننھی سی بچی ہے جو میرے ہاتھوں کے بنے نوالے کھا کر میرے بستر میں ہی سو جایا کرتی تھی —" ایک دم انہوں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھ کر کسی کو پکارنا شروع کیا۔ "اری زینو، او زینو — کچھ سوئیاں میٹھا ہو تو یہاں دے جا — میری بی بی آئی ہے۔" شاید وہ اپنی پڑوسن کو آواز دے رہی تھیں۔

ہائے یہ مجبور بڑھاپا — اور یہ محبت! میرا دل اندر سے رو اٹھا، میں خود کو سنبھال کر بولی — "آپ تکلیف نہ کیجئے دادی بی — مجھے بالکل بھوک نہیں ہے بس آپ بیٹھیں باتیں کیجئے آپ سے ملے اتنے دن ہو گئے کہ جی چاہتا ہے بس آپ سے باتیں کئے جاؤں۔"

"ہاں بی بی — وہ دکھ سے بولیں" اب تو بڑی ہو گئی۔ تو عقل مند بھی ہو گئی۔ کوئی میرے پکارنے پر پلٹا نہیں تو تو نے کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں — میں کیسے مان لوں کہ تجھے بھوک نہیں ہے۔"

ماحول اس درجہ دردناک ہو گیا تھا کہ مجھے اپنے آنسو روکنا دوبھر ہو گیا — کتنی ہی خاموشی چھائی رہی مانو جگ بیت گئے ہوں۔ پھر میں خود کو سنبھال کر بولی۔ "دادی بی یہاں تو آپ کی دیکھ ریکھ کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ آپ میرے ساتھ میرے گھر بمبئی چلئے نا —"

وہ کرب ناک انداز سے مسکرائیں۔ "بی بی جانے والی ہوتی تو پاکستان نہ چلی گئی

ہوتی۔ ایک ایک نے خوشامد کی مگر مجھے میری مٹی عزیز ہے۔ اب تھوڑے دن رہ گئے۔ کہاں جاتی پھروں گی ــــ بس خدا عزت سے اٹھا لے، یہی دعا ہے" پھر وہ کچھ یاد کر کے بولیں ــ "تیری نانی تو ابھی ہیں نا بی بی"

"ہاں دادی بی ــــ وہ ببلی کے پاس رہتی ہیں"

جس در و دیوار کے سائے تلے اور جس محبت بھری آغوش میں ہمیشہ میں ایک سکون پایا کرتی تھی آج وہیں مجھے کانٹوں کی سی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ اک درد سا دل میں اٹھ رہا تھا ــ جی چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روؤں مگر آنسو بھی جیسے مونہہ چھپا کر کہیں بیٹھ گئے تھے۔

"اچھا دادی بی اب میں چلوں ــــ" بڑی دیر بعد بڑی ہمت باندھ کر میں اتنا جملہ کہہ سکی ــ

اچھا خدا تیرا نگہبان ہو بی بی ــــ وہ ٹوٹی آواز سے بولیں ــ ایک دم انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"مگر ذرا ٹھہرو ــ اپنی عیدی تو لیتی جا ــ" اتنا کہہ کر انہوں نے ٹٹول ٹٹول کر اپنی بوسیدہ سی تھیلی کمر سے نکال اور اس کے اندر بہت دیر تک انگلیاں گھنگھولنے کے بعد ایک سکّہ نکال کر مجھ سے تصدیق چاہی۔

"دیکھ تو ذرا یہ چونی ہی ہے نا ــ؟"

میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی ــــ پھر انہوں نے اٹکل سے میرا ہاتھ تھاما اور میری بند ہتھیلی کھول کر چونی اس میں رکھ کر پھر سے مٹھی بند کر دی اور بڑے ہی رازدارانہ لہجے میں پوچھنے لگیں ــ "اچھا بی بی ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی ــ؟"

پہلی بار میں خدا کا شکر ادا کیا کہ دادی بی کی آنکھیں چلی گئی ہیں، ورنہ اگر دادی بی یہ دیکھ لیتیں کہ میرے جسم پر ہزار بارہ سو کی ساڑی ہے۔ بدن زیورات سے بوجھل ہے۔ سر پر سونے کا کلس جگ مگ کر رہا ہے اور میں بڑی سی کوٹھی سے اتنی لمبی چوڑی کار میں بیٹھ کر ان سے ملنے آئی ہوں کہ سڑک کاروں سے یہاں سے وہاں تک لبالب بھر گئی ہے تو ــ تو ــ تو ــ!

اب ضبط کی ہر حد ختم ہو چکی تھی۔ میں ننھے بچوں کی طرح کھلے دل سے چیخ چیخ کر رونے لگی۔ محبت کا وہ عظیم عطیہ وہ چونی جو لاکھ خزانوں پر بھاری تھی۔ میری ہتھیلی پر لرز رہی ــــ میں

ان چار آنوں سے کچھ بھی نہیں خریدوں گی — میں ان چار آنوں کو کبھی خرچ نہیں کروں گی۔ کیونکہ کہ یہ تو وہ عظیم رقم ہے کہ چاہوں تو اس سے ساری دنیا خرید لوں۔ لیکن میں یہ کیسے گوارہ کر پاؤں گی کہ اس دولت کو خود اپنے ہاتھوں سے کسی اور کو دے دوں — یہ چونی کسی دوکان دار کے ہاتھ میں نہیں جائے گی دادی ماں — یہ سدا میرے دل میں تجوری بن کر رہے گی۔

میں نے یہ سب کہنا چاہا لیکن آنسوؤں کی تیز بوچھار میں الفاظ ساتھ نہ دے سکے۔

⁂

سکھی سہیلیاں مجھ سے چھیڑتے پوچھتی ہیں۔ یہ کیا اپنے پریتم کی تصویر اس میں سجا رکھی ہے جو کبھی اس لاکٹ کو گلے سے الگ ہی نہیں کرتی —؟

لیکن میں یہ سوچ کر جواب دیتے دیتے رہ جاتی ہوں کہ اگر میں نے بتا بھی دیا کہ اس لاکٹ میں میں نے یہ کیا سجا رکھا ہے تو سننے والے کیا واقعی یقین کر لیں گے —؟

••

www.taemeernews.com

شہرِ ممنوع

سارا جھگڑا یہ تھا کہ نوری کی گوری گوری پنڈلی پر ایک کالا کالا تل تھا مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ بہتوں کی پنڈلیوں پر تل ہوتے ہیں۔

اصل جھگڑا یہ تھا کہ مدن میاں نے نوری کی پنڈلی کا تل دیکھ لیا تھا۔ اصل جھگڑا یہ بھی نہ تھا بات دراصل یوں تھی کہ نوری کی پنڈلی کے تل سے مدن میاں نے اور بھی کئی سلسلے ملائے۔ کچھ یوں سوچا کہ ہو سکتا ہے نوری کے اور بھی کئی جگہ تل ہوں۔ مثلاً کھلے گلے کے کرتے میں سے جو گوری گردن نظر آتی ہے، اس کے اتار پر کسی خوبصورت سے نشیب میں کوئی گم چاہا تل ہو۔ جیسے ادھر اُدھر کے خیال جاتے چلے گئے تو انھوں نے ایسٹن سے اپنی اماں کو راضی کیا۔ پندرہ ہی دنوں کے اندر اندر چٹ منگنی پٹ بیاہ کروا لیا۔

اور یہ سب کچھ ہوتا بھی نا اگر اس دن مدن میاں کا ادبدا کے نماز پڑھنے کو جی چاہ جاتا۔ لگ بھگ چار پانچ بجے کے اندازمیں انھوں نے عصر کی نماز کے لئے لوٹا اٹھایا——

پانی بھرا اور وضو بنانے بیچ آنگن جا بیٹھے۔ آنگن کے بازو دیوار تھی۔

دیوار سے لگ کر بیری کا چھتنار درخت تھا۔ جس پر دنا دن پتھر برس رہا تھا۔ ایک بیر پٹ سے آکر ان کے سر پر پڑا۔ انھوں نے سر سہلا لیا۔ دوسرا بیر چٹ سے آکر ان کی پیٹھ پہ گرا۔ انھوں نے تن تنا کر منہ پھیر کر ایک ادھ گالی گھنی ہی چاہی تھی کہ تڑ سے ایک بیر ان کی ناک

پر اگرا۔ اب تو ان کا ذہن چھلک گیا۔ چلا کر بولے:۔

"کون تمیس مار خانم ہے یہ ــــ ؟ ٹانگ سیدی کر دوں گا ابھی آ کے ــ!"

معلوم تھا گھر میں سوائے لڑکیوں کے ایسی ہستی کوئی نہیں بچا تھا۔ دھوپوں کی سنسناتی دوپہریں ہوں یا جاڑوں کی برفیلی چاندنیاں، بیچ کریاں سا کد کڑے لگاتی پھرتیں۔

رن میاں کے جواب میں ادھر سے ٹھن ٹھناتی ہوئی نوری آئی ــــــ نیلی شلوار جس کے پائنچے پڑھائے ہوئے۔ لال کھلے گلے کا کرتا، لال اوڑھنی۔ آتے ہی بولی:۔

"ہاں ہاں بھڑ آئیں گے بیر۔ تمہارا کیا جاتا ہے جی ــ ؟ بڑے آئے ٹانگ سیدی کرنے والے۔"

"اچھا ــــ تیری اتنی بڑی زبان ــــ ، ٹھہر تو سہی ــــ"

رن میاں بڑی گرمی میں آستین چڑھاتے ہوئے نوری پر لپکے۔ سمجھا ہوگا نوری آتا دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوگی ــــ مگر وہ تو ویسے ہی تنی کھڑی رہی۔ انہوں نے اس کی چٹیا گھسیٹ لی۔

"اب بول ــــ کرے گی زبان درازی ــــ ایں ــــ ؟"

"اوں ــ اوں ــــ" وہ چلائی ــــ "بڑے کہیں کے آئے۔ اس دن بھی لے کے۔ اتنا مارا اور اب بھی چٹیا نوچ ڈالی۔ ابھی اماں سے جا کر کہتی ہوں۔"

رن میاں سٹ پٹا گئے۔ "یہ پرکالہ چھوکری اب خالہ بی سے جانے کیا کیا جا لگائے" ذرا نرم پڑ کر بولے:۔

"کہاں مارا تمہارے میں نے ؟"

"ہاں ہاں ــــ اس دن آنگن میں ــــ چڑی چھکا" کھیل رہے تھے تو کس نے یہ اتنا بڑا ہنڈا پھینک کے مارا تھا ــــ ؟" ایکدم وہ تیکھی ہو کر بولی ــــ "کیوں جی یہ آنگن تمہارے باپ کا ہے ــ ؟"

رن میاں صاف مکر گئے۔ "جھوٹ بکتی ہے۔ میں نے تجھے تو تجھے کیا آج تک کسی نوکر کے بھی پتھر نہ مارا ہوگا۔"

"اوں ــــ جھوٹے کہیں کے۔ یہ دیکھو تو ــــ" اور اس نے جھٹ اپنی نیلی شلوار کا پائنچہ گھٹنوں تک چڑھا لیا۔

"یہ دیکھو۔ یہ نیلا نیلا نشان۔ پتھر کی چوٹ کچھ کم نہیں ہوتی۔ جی ــــ ہاں ــــ!"

"وہ کمبخت تو پتھر کی چوٹ بتا رہی تھی اور میاں دل چوٹ کھا گیا۔ بڑی اُجلی اجلی، دھلی دُھلی سی پنڈلی تھی ــــ اور غروب ہوتے سورج کی پیلی پیلی دھوپوں میں نہا کر تو سونا جیسی بن گئی تھی۔ نیل ویل کچھ بھی نہ تھا، ہاں ایک تل ضرور چمک رہا تھا ــــ کالا کالا۔

اور قبل اس کے کہ مدن میاں کچھ سنبھلتے یا کسی حیلے شوشے سے ابھی تھوڑی دیر اس کی پنڈلی ہی دیکھتے رہتے ــــ وہ پھر بھی تیتوں پر پھیتی، اپنی لال لال اوڑھنی کا آنچل لہراتی یہ جا ــــ وہ جا۔

مدن میاں کئی منٹ تک تو وہیں کھڑے رہے۔ عصر کا وقت ٹلا جا رہا تھا۔ ہڑبڑا کر نماز کو چل دیئے۔

ایک تھی شہزادی

"ہا ــــ بیچاری ــــ" دادی بی کو شہزادی پر بڑا ترس آیا۔ سر وہ تیغ کردہ سکتہ سی ہو گئیں۔

"تو آگے ہوا کیا ــــ؟" کسی نے بیچ میں ٹوکا دیا۔

"اے ہوتا کیا ــــ؟ نصیبوں جلی کی قسمت میں تو ٹھوکریں ہی لکھی تھیں۔ کبھی تو بھول کے مسکرانا نصیب نہ ہوا اس کو ــــ!"

"بھئی اللہ ــــ دادی بی ــــ آپ تو ایسے ترس کھا رہی ہیں وہ سچ مچ کی ہوئی شہزادی تھی جیسے ــــ پھر آگے سنایئے نا ــــ"

"کیا سناؤں ــــ؟ مجھے نیند آ رہی ہے اب ــــ" دادی بی نے منہ پھاڑ کر جمائی لی۔

"دادی بی اگر آپ نے کہانی پوری نہ کی نا تو یاد رکھئے ہم کل آپ کا پاندان چھپا دیں گے پھر لیتی رہئے گا جمائیاں ــــ ہاں ــــ!"

دادی بی نے پھر ڈوری پکڑی۔

"اے جب بڑی کرموں جلی تھی۔ پیدا ہوتے وقت کوئی منحوس مارا گھڑا ہوگا، تبھی تو۔ اب آجا کے رانی کو یہی سوجھا کہ نہ سہی کوئی شہزادہ، کسی وزیر زادے ہی سے نکاح پڑھوا دیں۔ اے کرتی بھی کیا بیچاری! ماں جو کہتے جا رہے تھے شہزادی کے۔ اِدھر رانی چپکے رہ کے جان کھائے جاتی۔

"اجی سنتے ہو! لڑکی دکھائی نہیں دیتی سامنے —؟ جیسے سفید دانت ہیں ایسے ہی سفید بال بھی ہو لیں، تب اٹھانا۔ ہاں آگے کہو تو۔"

"مگر اب کہاں سنتا اس کی بات۔ وہ تو محل میں یونہی بھرے بھرے ہی آتا ہے"

"تو دادی بی، —" بیچ میں ننھو میاں نے بات کاٹی — "آخر اس غریب شاہزادی کی شادی ہوئی بھی کسی سے —؟"

"اے لو اور سنو — کہانی کا انجام پہلے ہی سے سنا دیا تو کیا مزہ رہا —؟ ویسے تھی نصیبوں کی پوری بچاری۔

ہاں تو رانی نے سوچا کہ یوں تو بات نہیں بنتی۔ ایسا کریں گے کہ ایک دن... ..."

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری۔ اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بڑی بچی سے بولے :-

"اجی سنتے ہو بھابی جان! وحدن میاں نے اپنی خلیری بہن نوری سے شادی رچالی؟"

"ہائیں —؟ کیا کہتے ہو میاں —؟" وہ نیند میں جھپکیاں لیتی پڑی تھیں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں — "ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا —؟"

"ہو سکنے کی بات تو جانے ہی دیجئے — ہو چکا ہے!"

بڑی بچی چڑ کر بولیں: — "موئے کُن کی نہ ڈھنگ کی، کس بات پر ریجھ گئے صاحبزادے! سارا دن تو گلی کے لونڈوں کے ساتھ بڑ بونگ مچاتی پھرتی ہے۔ تو کیسا زمانہ لگا ہے۔ بچپن کی نسبت بغیر پوچھے گچھے توڑ پھینکی۔ موئی نسبت نہ ہوئی پتنگ ہو گئی۔ جب دل چاہا اتار لی۔ مگر یہ ہوا کیسے —؟"

"بھائی جان — اب پہلی کا جوڑ تھا ل گیا۔ جو ہوا سو ہوا مگر اب ہماری ننھو میاں کا کیا ہوگا —؟ اور پھر ننھو میاں کی وجہ سے ربو میاں کا کیا بنے گا؟ ربو کے سسرال والے تو یوں ہی ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں۔ جیسے تیسے انھیں ٹال ٹاپ دے دے کر انھیں روکے ہوئے ہوئے تھے۔ اب تو وہ صاف کر دیں گے — نا بابا، ہم اور انتظار نہیں کر سکتے۔ ایسے کیا میرے جڑے ہیں تارے مٹی میں کیوں جھوٹ کہتا ہوں —؟"

بڑی بچی نے بڑی حسرت سے ننھو میاں کی طرف دیکھا۔ جو بد نصیب شہزادی کی کہانی آنکھوں میں نمی سے سن رہی تھی۔

شمر منوٹ

گھر نہ دیوار

ابھی شجو ماں بغدادی قاعدہ ہی پڑھتی تھی کہ مدن میاں سے بات پکی ہوگئی۔ ربو بجو شجو ماں کے لگ بھگ تین برس بعد پیدا ہوئی تھی۔ ابھی بالکل ہی گڑیا جیسی تھی۔ مگر وہ بھی اپنے چچا کے بیٹے کو منگنی ہوئی تھی۔ ادھر بغدادی قاعدہ سامنے دھرا ہوتا اور ادھر شجو ماں کی مدن میاں سے نوکا جھونکی چلتی رہتی۔ پہاڑے یاد ہوتے رہتے اور مدن میاں سے ٹھٹولا ٹھالی چلتی رہتی۔ دیکھنے والے دیکھتے رہتے اور ہنس دیتے۔ بڑی بی کہتیں،۔

" اے ہمارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے ہنسی آتی ہے نا۔ ہمارے ماموں تو اپنی ہونے والی دلہن کو گودوں میں اٹھائے پھرتے رہتے ہاں اور کیا! اور بھئی یہ تو ہونا ہی چاہئے میاں بی بی کی عمر میں اور کچھ نہیں تو دس برس کا فرق تو ہو۔ ورنہ یہ کیا ہے۔؟ بی بی صاحبہ کے تو دانت بھی کھل کھلے ہوگئے اور میاں ہیں کہ وہی تنی ہوئی کاٹھی اور کوے کے پروں ایسا سر لئے گھوم رہے ہیں۔ اسی سے تو نا چاقی بڑھتی ہے۔ میاں تو دیکھنے میں جوان اور بی بی بوڑھی۔ ــــ یوں نظروں سے بی بی گرے تو زندگی کی ہنڈی تو تیار ہے ہی۔ مرد کی کاٹھی کو توت کہاں پائے۔"

مدن میاں اور شجو ماں کا بھی اچھا خاصہ فرق تھا۔ سب کے ساتھ شجو ماں بھی اپنا بھولا بھولا منہ اٹھا کر انہیں مدن بھائی کہتی، مگر کوئی نہ کوئی اسے ٹھوکا دے ہی دیتا:۔

" اری کل مجھی! بھائی پکارتی ہے ہونے والے دولہا کو۔"

اب شجو ماں کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ دولہا کیا ہوتا ہے، مگر اتنا ضرور معلوم تھا کہ دولہے کے نام پر شرمایا جاتا ہے۔ بس وہ گٹھری سی بن جاتی۔

مدن میاں وکالت پڑھ رہے تھے، گویا بڑی انوکھی بات کر رہے تھے، اگر ساس سسر خوش تھے۔ پڑھے لکھے داماد تو ان دنوں بولتی سپاری اور ہنستی لونگ کی طرح عنقا تھے۔ اب یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے کہ شجو ماں کو تو وکیل دولہا ملے اور ربو بیچاری کو جاہل جٹ گنوار کاٹھ۔ ماں تو یہی سوچ کر نڈھال ہوئی جاتیں کہ کیسے یہ جوڑ نبھے گی۔؟ کیونکہ اور کچھ نہ سہی مگر ربو خیر سے بغدادی قاعدہ اور کلام مجید تو پڑھ ہی چکی ہے۔ دو کتابیں اردو کی۔ اور پھر دس

نمک چبانے بھی ـــــ تو یاد تھے اُسے !

ادھر نجو ماں نے سولویں میں اور ربّو نے تیرہویں میں قدم رکھا نہیں کہ ادھر سے ربو کے سسرال والوں نے اودھم مچا دی۔

"اے ہے دیکھو تو سہی! جان جوان بیٹی یوں ہی بٹھال رکھی ہے۔ آخر کب اُٹھانے کا ارادہ ہے۔"

پیغام تو دونوں کے موجود تھے۔ مگر دن میاں کی اماں کہتی تھیں، اماں کیا کہتی تھیں، خود دن میاں کہتے تھے کہ پہلے ایل۔ ایل۔ بی کی خلعت پہن لیں ـ پھر کریں گے شادی وادی بھی ـ ربو کے سسرال والوں نے کیا کیا گھائیاں نہیں گھمائیں ـــ!

"اے ہم تو پچھتائے ان کے گھر کی بیٹی اٹھا کر۔ نوج کوئی اس عمر کو مل جانے دے۔ اب تو ٹانگ سے باندھ رکھا ہے۔ پھر ڈھلتی بھی اٹھانا ہے"

بڑی بی نے انھیں بڑی صلاحیت سے ٹلوا دیا ـــ

"بات کرتے میں تین برس نکل جائیں گے۔ پھر دیکھو دو منڈوے ساتھ ہی ساتھ پڑیں گے۔ اے بہن ـــ! تم اپنی ہی والی ہو، ذرا سوچو تو سہی۔ چھوٹی کو وداع کر کے بڑی کو نہ اٹھایا تو کہنے والے کیا نہ کریں گے، میرے منہ پر کہہ ہو گا بڑی میں کوئی عیب، تبھی تو چھوٹی کو اٹھا دیا۔ اب اللہ سمجھے تم لوگوں سے کیا پردہ۔ بس ایک ہی مجبوری ہے۔ اور اتنا تو تمہیں معلوم ہے بہن کہ کرنے دھرنے والی اکیلی میں ہی میں ہوں ـ"

یہ بڑی بی کے میاں سید رزاق بھی بڑے گنوں کے تھے۔ اب بڑھاپے میں اگر بڑے نیر ھے بن گئے ہیں ـــــ کیا کیا جلاپے انھوں نے بڑی بی کو نہیں دیئے ؟ بس کھولتے پانی میں ڈال کر جوشش تو نہیں دیا۔ باقی سب کھیل کھیل ڈالے۔ ساس نندیں تو بیٹے بھائی کے کرتوت سے کاہے پردہ اُٹھاتیں۔ مگر موٹی نند نے بھولپن سے ایک بار کہا بھی تھا کہ :-

"بھائی میاں نے گوری بھاوج کے چرکے بھی لگائے تھے دست پناہ سے ۔"

اب جھوٹ سچ تو اللہ ہی جانے کہ اس جھنجٹ کے پیچھے کیا گل کھلے ہوئے تھے۔ بات" وہی ایک بات، عشق و محبت کی یہ وارداتیں آج کل سے نہیں، اس گھڑی سے چلی آ رہی ہیں جب کہ آدم نے بی بی حوا کی کھوج کی تھی۔ یہ رزاق میاں اپنی ماں کی گوری چٹی پکے پان جیسی اجلی بھاوج کے لیے وقف تھے۔ اب بہن دل پر کس کا بس چلا ہے ـ! یہ کھیتوں پر نگرانی کے لیے جاتے تھے۔ وہیں

جو بنیریاں پر کوے کسان کی لونڈیا سے آنکھ لڑ گئی۔ ان کا تو کچھ گیا، برس پیچھے وہ ضرور ایک ڈالی پلے کی ماں بن گئی۔ اس کو تھاپ پر تھاپ دیئے جاتے تھے کہ بس شادی کروں گا تو تجھی سے، ورنہ زہر کھا لوں گا۔ اس بیچاری کو تو یوں ہی برادری والوں نے نکال باہر کیا تھا۔ کرتی بھی کیا۔

اب ادھر ماں باپ نے شادی کی بات اٹھائی۔ پہلے والے تو اپنی بات کے پکے ہوتے تھے۔ رزاق میاں کی ایک نہ چلی۔ باپ نے یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ "اسلام میں چار چار جائز ہیں۔ ارے میاں بہت ہوا تو اس سے نکاح پڑھوا لینا۔"

مگر کھلے بندوں چھٹی تو انہوں نے بھی نہ دی۔ سید تھے۔ بات کیسے گرنے دیتے۔؟

بڑی بی بیاہ کر بھی آ گئیں، مگر میاں کے تیور وہی رہے۔ اب بھی جب تب کر جو بنیریا پر جاتے۔ گر مارے باندھے کے چار چھ بچے بڑی بی سے بھی ہو گئے۔ یہ بیچاری بڑی صابر تھیں۔ کبھی منہ سے نہ پھوٹتیں۔ ہو جو پڑی وہ جھیل گئیں۔ کبھی بھولے بسرے ایک حرف شکایت کا زبان پر لاتیں بھی تو سننے والیاں یوں اُچھالتیں۔

"اے واہ، یہ اچھی سنائی ہوا۔ کیا محبت نہیں، پیار پیرت نہیں تو پھر یہ بچے کیسے ہوتے"،

بڑی بی ایک بار تو جل کر بول گئیں:- "اے بچوں کا نہ کہو۔ بچے تو کتے بلیوں کے بھی ہو جاتے ہیں، ہمارا کیا ہے۔؟"

پورے سسرال میں وہ تھڑی تھڑی ہوئی کہ بڑی دلہن نے تو اپنے بچوں کو کتے بلیوں کے مقابل بٹھا دیا۔ ایمان کی بات تو یہ تھی کہ کتے بلیوں کی بھی تو اپنی مرضی ہوتی ہو گی۔ یہاں تو یہ حال تھا دادا حضرت زبردستی اندر بھیج کر باہر سے کنڈی چڑھا دیتے اور مارے باندھے کے جوں توں رزاق میاں کو رات بی بی کے ساتھ بسر کرنی ہی پڑتی۔ گر سورج شام کو تو ڈھلتا ہی ہے۔ دن بھر کتنا جگمگائے۔ اب تو رزاق میاں رستے پر آ گئے تھے۔ جو بنیریا دال سے بھی پیچھے اوپر تین میں بچے ہوئے گرد نچوڑی ہوئی ہڈی کو کون دسترخوان کی زینت بنا لیتا ہے۔؟ دودھ جیسا بے داغ اور سنگ مرمر ایسا چمکیلا اور سفید جسم جب تک ساتھ دے گیا۔ —— دے گیا۔ پھر وہ آپ ہی آپ دل سے، نظروں سے اُتر گئی۔ گاؤں کے حاکم تھے، کس کی مت ماری گئی تھی کہ فضول پر چوں کرتا پھرتا۔

یوں تو بہو کے سسرال والے اس گھڑی مان گئے۔ گر اُدھر مدن میاں نے وہ ترقی پسندی دکھائی کہ بڑی بی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اب تو کوئی ٹھور ٹھکانہ بھی نہ تھا۔ منگنی ہوئی لڑکی کا پیغام ٹوٹ جانا میاں تو ایسا سمجھا جاتا کہ حرام کا پلا جننے والی اس سے اونچی تھی۔ لوگ باگ یہی

تو پوچھیے کہ آخر ایسی کون سی خرابی تھی کہ ٹھیکرے کی ٹانگ ٹوٹ گئی — ! پھر وہ تیرکٹ والے ہی بیاہ لے جائیں، — بیاہ دے جائیں۔ اپنے والے تو بھول کے بھی ذکر نہ کرتے۔ بلکہ موقع ملے تو اور پردے اٹھاتے۔ اور یہاں تو سوال بڑی بیٹی کا آپڑا تھا۔ رو ہوتی تو ایک بات بھی تھی، وہ پھر بھی پھوہڑ تھی۔ پہلے تو قسماں یوں ہی بڑی کال اور اس پر سے پیام بھی جاتا تھا۔ بڑی بی تو واسوں ہوتے بھی پاگل ہو کر رہ گئیں۔ بلو پیار پسار کے من میاں کی کڑیل جوانی کو کھنے دیتیں۔ پھر آج کے دوری پر ہوائیں پڑتیں۔

" اے بی ہمیں سب معلوم ہے۔ آج کل ہوا ہی چلن ہو گیا ہے۔ کھلے بندوں، چڑھاوے کے بیلوں کی طرح جوان جہان لڑکیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ ہی لڑکوں کی نگاہ پڑے گی اور من مانی کریں گے۔ کیا ہم نے دیکھا نہیں اتنی بڑی سنڈی کی سنڈی آنگن بیچ کدکڑے لگاتی پھرتی ہیں۔ اب میں کہوں خالہ کا چھوکرا ہوا تو کیا غضب ہو گیا، اے تو نامحرم۔ معلوم ہے جی، یہ سب چال پہلے کی چلی ہوئی تھی — "

اب یہ تو اوپر والے کو ہی معلوم تھا کہ چال واقعی چلی ہوئی تھی یا اچانک ہی وہ سیاہ قلم گھوما کی تقدیر کی سیاہی بن کر ان کے وجود کو کھا گیا! مگر کوسنوں سے ہونا ہی کیا تھا۔ ! چڑا تو ہاتھ سے اڑ گیا تھا — !

" کاگا رے کاگا — تیرے پیر میں باندھوں سونے کا دھاگا
میرے بھاگوں کوئی مہمان آتا ہو تو — تو — اڑ جا

" ہائے بیچاری شہزادی، روز بلا محل کے پیچھے پچھڑی ہو کر یہ آواز لگاتی۔ سیکڑوں کوے منڈیر پر بیٹھے کے بیٹھے ہی رہتے، کوئی بھی تو نہ اڑتا "

" ہائے۔ تو دادی بی ایسا کہنے سے کیا ہوتا ہوگا بھلا — ؟ "

یہ رہو بیچ میں دادی بی کو ٹوک ٹوک دیتی تھی۔

" پھر بیچ ہی ٹوکا نا! اری کلموہی، کوے کو پکار کر اس کے پیروں سونے کے دھاگے باندھنے کا لالچ دے کر اس سے پوچھو، میرے گھر کوئی مہمان آنے والا ہے — ! اگر اڑ جائے تو سمجھو بالم کو سندیسہ پہنچانے اڑ گیا، اور بیٹھا ہی رہے تو سمجھو بالم نام کوئی ہے ہی نہیں۔ اڑے بھی تو سندیسے کیسے ہاں، اب سے بیچ میں نہیں بولنا۔ تو بس بیچاری شہزادی کھڑے کھڑے تھک جاتی، مگر اس کے نصیب کھلنے تھے نہ کھلے۔ اور بیچاری کو شہر ممنوع میں جانے کی اجازت کبھی نہ ملی۔ اللہ کا نام مرا اس

کا کام پڑا ـــــ ایک دن ـــــ"

"یہ شہرِ ممنوع کیا ہوتا ہے دادی بی ـــ ؟" شجو ماں نے بہت ہی سادگی سے سوال کیا۔

دادی بی نے یوں ٹوکے جانے پر گھور کر دیکھا، مگر چونکہ شجو ماں بہت کم کوئی سوال کرتی تھی، اس لئے پیار سے بولیں: ـ

"اے تم نہیں سمجھیں کیا! بادشاہ کی مملکت میں ایک بڑا سا باغ نما شہر ہوتا تھا بڑا رنگ برنگا۔ وہاں صرف وہی لوگ جا سکتے تھے جن کی شادیاں ہو چکی ہوں۔ اور پھر وہ جوڑے وہاں ایک رات گزار کر واپس آ جاتے تھے۔ اور پھر وہ شہر ان کے لئے شہرِ ممنوع ہو جاتا تھا۔"

"تو دادی بی وہاں کنواری لڑکیاں نہ جا سکتی ہوں گی؟"

"لو اور سنو! وہاں بھلا کنواریوں کا کام! شہرِ ممنوع جو نام پڑا تو تم ایسی کنواریوں کی وجہ سے ہی پڑا۔ کھلی بستی ہوتی تو کیا بیاہی، کیا ان بیاہی، سبھی دھول اڑاتی پھرتیں، مگر وہ تو شہرِ ممنوع تھا۔"

"توبہ ہے، بیچ بیچ میں سور غنے پڑ جاتے ہیں۔ ہاں تو اللہ کا کرنا ہوا یہ کہ ......"

اسحاق میاں ہمیشہ کلائیمکس کے عین بیچ کر ایک ادھ زوردار ہوائی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بولے: ـ

"ابی سنتی ہو بھابی جان! وہ جمو میاں کے ابا ملے تھے۔ ربو کی شادی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ یہ بھی صاف صاف سنا دیا کہ اگر جلدی شادی نہ کی تو پھر پیام ٹوٹا ہو سمجھئے"

"ہائیں! ..." بڑی بی چھالیاں سی لے رہی تھیں، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا ـــ ؟"

"ہو سکنے کی بات جانے دو، ورنہ جو ہو گیا تو سر پکڑ کر جھینکتی رہنا۔ میں کہتا ہوں کہ ہی دونا ربو کے ہاتھ پیلے۔ اب اس بیچاری کے نصیب تو دغا دے گئے۔ تم ہی سوچو ـــــ ایک تو یوں ہی بیٹھی ہی ہے۔ دوسری بھی چھاتی پر مونگ دلے گی۔ کیوں جھوٹ کہتا ہوں میں ـــ!"

"نا میاں ـــــ تم جھوٹ کاہے کو کہو گے! مگر یہ تو سوچو شجو ماں بڑی ہے۔ آنکھوں ہوتے دیکھے گی کہ چھوٹی گھر بار برت رہی ہے۔ بیچ جھلا رہی ہے تو اس کے دل پر کیا بیتے گی؟"

"بھابی جان اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں، مگر تم گہرائی میں تو جاؤ نا۔ ایک کے ساتھ دوسری کی بھی زندگی تباہ کرنا کہاں کی ایسی دانشمندی ہے۔ اس کے نصیبوں کا بھی کوئی تخت کا شہزادہ آئے گا۔

جائے گا۔ ہم ایک گنا فکر کرتے ہیں تو اوپر والا ہزار گنا کرتا ہے۔ ہاں آگے تم سمجھو۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو بیٹھی رہے گی ستارے کو ملے سے گھٹ کر ______ فکر میں دب کر کموڑا مر نہیں جاتا۔ "کہتے تو ٹھیک ہو میاں۔ ابھی تو اللہ ہی جانے اور کیا کیا دیکھنا اور سننا پڑے۔ کنواری مٹی اور پہاڑ کو تولو، پھر بھی پہاڑ ہی اوپر اور پر اٹھتا چلا جائے۔ یہ پڑا بڑا بھاری ہوتا ہے میاں۔"

اندھیرا

بچپن سے شجوماں یہی سنتی آئی تھی کہ دو منڈوے ساتھ ساتھ پڑیں گے، ساتھ ہی ساتھ ہلدی چڑھے گی، مہندی لگے گی اور دونوں ساتھ ساتھ ڈولی میں چڑھیں گی۔ یہاں تو بیچ میں ہی ذوک کے رہ گئی۔ کان تو شجوماں کے بھی تھے۔ بڑے ٹھنڈے دلوں سنا کہ ربو کی شادی ہو رہی ہے۔ جس کا ابھی صرف سولواں ہی تھا اور یہاں شجوماں تو اٹھارواں بھی پھلانگنے کی سوچ رہی تھی۔

سر جھکائے جھکائے شجوماں نے ربو کی کرتی میں پلکے کا سرا لگایا اور ٹپ سے دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کی گود میں گر پڑے۔ وہ تو اچھا ہوا کسی نے یہ جگنو چمکتے دیکھے نہیں، ورنہ کہنے والوں کے منہ تو بند نہیں ہیں۔ کچھ بھی اڑ جاتی۔

"اوئی بہن کا سکھ دیکھا نہیں جاتا"

"منہ زور جوانی ہے، سنبھالی نہیں جا رہی ہوگی۔"

وہ تو پہلا تیر تھا جو اس کے دل کو چھید گیا۔ اب تو یہاں دن رات دھڑا دھڑ جوڑیاں سل رہی ہیں۔ اس پر بانکڑی ٹنک رہی ہے۔ گوٹے دوپٹے چنے جا رہے ہیں اور کرن ٹنک رہی ہے۔ کرتے قطع کئے جا رہے ہیں اور گلے تو ڈھے ٹنک رہے ہیں اور ان سب کاموں میں شجوماں آگے آگے ہے۔ ربو تو دن رات پلنگ توڑتی یا ہم سن سہیلیوں سے کھسر پھسر کرتی رہتی۔ سارا کام شجوماں کے سر تھا۔ گڑیاں بھی سُن رہی ہے۔ جانے جا پڑتال بھی پڑ رہی ہے۔

"اے ہے شجوماں! یہ دیکھو مونڈھے کے پاس سے لہر یہ ٹیڑھی ٹانک دی۔"

"اے بی تمہیں آنکھیں نہیں ــــ! یہ بانکڑی میں نے تمہیں کرتی پر لگانے کے لئے دی تھی ــــ۔"

سر پر دن گزرے جا رہے تھے۔ جیسے پروائی کے جھونکے۔ دیکھتے دیکھتے شادی کا بھی دن آ گیا۔ شجوماں نے اپنے ہاتھوں دلہا میاں کی سلامی کی تھالی سجائی۔ ادھر ربو دلہن ہی

بیٹھی تھی اور آج کئی دنوں بعد پھر ننھو ماں کی آنکھیں برسے جا رہی تھیں۔ کون جانے یہ آنسو بہن کی جدائی پر تھے یا اپنی بدنصیبی پر!۔

مہمان بیبیاں آ رہی تھیں۔ جان بوجھ کر بڑی بی بی کے پاس رکتیں اور پوچھتیں:۔

"اری بہن، ہم تو یہ سنتے آ رہے تھے کہ دو منڈھے پڑیں گے ۔۔۔ یہ ہوا کیا ۔۔؟"

"لے بہن، یہی وہ تمہاری بچی ہے جس کا ناطہ ٹوٹ گیا۔"

بڑی بی بی جوتی بی بی ادھر ادھر منہ چھپاتیں۔ بہانوں سے منہ پھیر پھیر کے آنکھیں پونچھتیں۔ اور ادھر ننھو ماں پھرکی بنی سارا کام نبیڑ رہی تھی۔ ہر احسان سے عاری۔ ابھی جہیز کے کپڑے میں ساڑیاں لا لا کے جا رہی تھی تو ابھی باورچی خانے میں کھانے دانے کی خبر لینے جا پہنچی۔ ابھی پھلواری سے سہرے کے لئے پھول لے رہی ہے تو ابھی عود دان میں انگارے لئے ربو کے بال سکھانے لپک رہی ہے۔

ننھو ماں کی نیند سے آنکھ کھلی تو کب کھلی، جب میراثن نے ڈھولک پر تھاپ دی۔

"تاروں میں جلوہ دوست بابا، جلدی گھر کو جانے دو۔"

سلامی کی تھالی لئے وہ لپر جھپر چلی جا رہی تھی۔ اک دم اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔ سامنے کی سکھی سہیلیاں سب ربو کی جان پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ جہاں آرا، جس کی شادی کو سال بھر ہو گیا تھا اور اب تو گود بھی بھری پڑی تھی، ربو کو چھیل رہی تھی:۔

"اری سنتی ہے ۔ جلوے میں اتنی بھی دیر دیر ہو۔ ادھر بنے میاں انتظار جو فرما رہے ہیں"

ربو گٹھری تو بنی رہی، اور بھی سمٹ گئی۔

"اری یہ سب چالیں ہیں،" کوئی دوسری بولی، ۔۔۔ "ہم سب سمجھتے ہیں۔ دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے کہ کب جائے اور کب دولہے میاں کو اپنے ہاتھوں پان بنا کر کھلائے ۔۔۔"

ننھو ماں کے قدم سو سو من کے ہو گئے۔

"تجھے قسم ہے ربو جو دو گھنٹے خوشامد نہ کروائی ہو۔"

"ارے یہ رات ایک ہی بار تو آتی ہے ۔"

چھن چھن ..... چھن ... چھن ... تھالی گر گئی اور سلامی روپے پیسے کے پڑے، مع چکنی، الائچی، لونگ کے برآمدے میں بکھر گئے۔

پھر شجو ماں کو معلوم نہ ہو سکا کہ کب ربو کی رخصتی ہوئی۔ واقعی تاروں کی چھاؤں میں ہوئی یا ابھرتے تاروں میں ہو کر وہ جلد ہی خوش خوش کروانے چلی گئی۔ مگر جب شجو ماں کو ہوش آیا تو اس کی آنکھوں تلے سیاہ سیاہ گھیرے تھے۔ دل چلتے میں رہ رہ کے زور زور سے دھڑک اٹھتا، چکر آتے تھے۔ اور ادھر ربو تھی کہ شادی کو ڈیڑھ دو ماہ بھی نہ ہوئے تھے۔ جماہیاں بھی پوری نہ ہوئی تھی، شرم بھی نہ ٹوٹی تھی ساس نندوں سے کہ گھونگھٹ کا پردہ اٹھا اٹھا کر وہ ابکائیاں لینے اور قے کرنے لگی۔

ربو کے میاں شہر میں کوئی کاروبار کرتے تھے۔ ہفتہ میں چار دن باہر گزارتے چار دن گھر پر رہتے۔ داماد آتے تو شجو ماں ہی ان کا کمرہ سلیقے سے سجاتی۔ لاکھ صفائی، جھاڑ پونچھ کرتی، مگر ربو صبح اٹھتی تو وہی پھیروں کا رونا لے کر گال سہلاتی ہوئی، زیر لب مسکراتی ہوئی۔

"اپی جان، غضب ہے اللہ کا! یہ مچھر کاہے سے ٹوٹ پڑے ہیں۔"

سلیمن ایک دن دیدے مٹکا کر بولی، —

"ہاں شجو بی بی، ننھا ننھا یہ مچھر۔ توبہ ہے! اتنا بڑا مچھر ہے، ایک دو نہیں پورے بتیس دانت ہیں اس کے منہ میں۔ اور کمبخت جب ڈنک لگائے گا تو چہرے پر۔ گالوں پر ہونٹوں پر، کیوں ہے نا ربو بی بی — ؟"

ربو بی بی مسکرا کر اور بن کر شرماتی ہوئی اسے مارنے کو لپکیں اور شجو ماں کی آنکھوں میں رات کی بھرپور سیاہیاں تیر تیر گئیں۔

"شجو ماں کو کب تک یوں ہی بٹھائے رکھو گی — ؟ کہیں کر ڈالو نا بہن۔"

"اللہ رکھے چھوٹی تو بھولا بھلانے کو ہو رہی ہے اور بڑی ابھی تک بیٹھی ہی ہے۔"

آنے جانے والیاں جان بوجھ کر، جان جان کر، سوئیاں سی چبھوتیں اور بڑی بی بی کا منہ نہ اٹھتا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکیں۔

"سلیمن، توبہ ہے! اتنی شکر کیوں بھر دی حلوے میں — ؟ دیکھتی نہیں ربو کو ابکائی پر ابکائی چلی آ رہی ہے۔"

"اجی بی بی، یہ ابکائی پھیکا کھانے سے نہیں رکنے والی۔ ہماری بی بی اللہ رکھے گود بھری ہونے والی ہے۔" سلیمن ہاتھ چلا چلا کر بولنے لگی۔

شجو ماں اپنی بڑی آنکھوں میں حیرت لئے کبھی ربو کا منہ دیکھتی تو کبھی سلیمن کا۔ دوسرا

قدم جو اس کا اٹھا تو وہ مشین پر جا بیٹھی۔ دبلے پتلے کانپتے ہاتھوں سے اس نے پھول دار گلابی ریشم اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے کرتے قطع کرنے لگی۔

بڑھاپا

(بلی اور وقت چلتے ہیں تو پاؤں کی آواز نہیں پیدا ہوتی، گر چلتے دونوں ہی ہیں۔ وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا، بالکل دبے پاؤں۔ بلی کتنی ہی اونچائی سے گرے، پنجوں کے بل گرتی ہے۔ آواز نہیں پیدا ہوتی۔ وقت اور زمانے کے کوڑے بھی دل پر کیسے ہی برسیں، آواز نہیں پیدا ہوتی۔ ہاں آنکھیں ضرور دھندلا جاتی ہیں اور بالوں پر راکھ جم جاتی ہے۔)

"باورچی خانے سے شبو ماں نکلی تو بلیسی بولی،۔

"بی بی! سر تو جھاڑ لیجیے، راکھ جم گئی ہے۔" شبو ماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ گر یہ آخری تیر تھا۔ چپکے سے یوں ہی شبو ماں نے آئینہ تھاما تو کئی زمانے اس کی آنکھوں کے آگے سے گزرتے چلے گئے ـــــ گزرتے چلے گئے ـــــ گزرتے چلے گئے اور اپنے تڑپانے والے قدموں کی سفید سفید دھول چھوڑ گئے جو اور کوئی مناسب مقام نہ پا کر شبو ماں کے سر پہ جم گئی۔

وقت گزرتا ہے تو اپنے ساتھ وہ ولولے اور آرزوئیں بھی لیے جاتا ہے۔ جن سے دل کی بستی آباد ہوتی ہے۔ گر شبو ماں کا دل کیسا نگر تھا کہ کبھی تو ویران نہ ہوا۔ اگلے سے پچھواڑے سے، جہاں موقع ملتا وہ گھر کے چھجے پر چڑھ جاتی اور گنگنیا گنگنیا کر ایک ایک کوے سے مخاطب ہوتی۔

"کاگا رے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا

میرے بھاگوں کوئی مہمان ہو تو تو اڑ جا۔"

گر سونے کی پائل کا لالچ بھی انہیں نہ رجھاتا۔ مزے سے بیٹھے کائیں کائیں کیے جاتے۔ کوئی تو ایسا نہ تھا جو اڑ کر بالم کا سندیسہ لاتا اور اس شہر ممنوعہ کے دروازے اس کے لیے کھل جاتے۔

"ہائے بیچاری ـــــ دادی بی کی شہزادی کو اب تک بھی شہزادہ نہ ملا۔" وہ اپنی مخصوص ادا سے اب بھی پان چباتے ہوئے ـــــ ہائے ـــــ بیچاری شہزادی ـــــ" کہہ کر پھر سے کہانی

شروع کر دیتیں۔

کبھی کبھی شبو ماں محسوس کرتی کہ اس کہانی کی شہزادی اور کوئی نہیں، وہ خود ہے۔ جسے کبھی شہزادہ نہیں ملا ــــ نہیں ملے گا۔ دل میں ڈر لیے کبھی کبھی وہ چاہتی کہ اس کہانی کا انجام پوچھ لے۔ "دادی بی! پھر اس شہزادی کے لیے شہر ممنوعہ کے دروازے کھلے ــــ؟" مگر یہاں پہنچ کر وہ آس بھی دھواں بن کے اڑ جاتی تھی جس کے سہارے وہ جی رہی تھی۔ شبو ماں کے منہ کا تالا کبھی تو نہ کھل سکا۔

"اے ــــ بیچاری شہزادی ــــ دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ گزرا ــــ اور ایسا گزرا کہ شہزادی کے بالوں پر برف سی پڑ گئی۔"

شبو ماں نے گھبرا کر اپنا مرجھائے پھول ایسا چہرہ یا زان پر لگے آئینے میں دیکھا۔

"دادی بی ــــ" وہ چلا اٹھی ــــ "کوئی دوسری کہانی سناؤ ــــ دوسری کہانی سناؤ ــــ دادی بی یہ کہانی تو برسوں سے ادھوری ہے۔ شہزادی کو شہزادہ نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں ملے گا ــــ مجھے معلوم ہے ــــ مجھے سب کچھ معلوم ہے دادی بی ــــ"

اور وہ تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

سہارا

بچپن میں شبو ماں نے بغدادی قاعدہ پڑھا تھا، پھر اردو کی چار پانچ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ماموں بیچارے پہلے تو رفت، رفتن کی گردان پڑھی، پھر شیخ سعدی کی "گلستان" "بوستان" بھی پڑھ ڈالیں۔ ماں نے منع بھی نہ کیا، کیونکہ معلوم تھا کہ ہونے والے دولہے میاں بھی پڑھ رہے ہیں۔ دولہے شروع کیا اور میں تک پہاڑے بھی رٹ ڈالے۔ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ تختہ ہی الٹ جائے گا اور پڑھا لکھا سب خاک میں مل جائے گا۔ اب گھر میں بیٹھے بیٹھے کوئی کام تو تھا نہیں، اسحاق چچا کی بیٹیوں کو الف، بے کی تختی یاد کروانی شروع کر دی۔ اسحاق چچا کی بیٹیوں کے ساتھ کھیلنے والیاں بھی تھیں، وہ بھی پاس آ کر بیٹھنے لگیں۔ پھر ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ شبو ماں کی اچھی اچھی جماعت جڑ گئی۔ دس برس کے اندر کے لڑکے بھی آنے لگے اور یوں ادھر ادھر کے ملا کے بیس بچے ہو گئے اور شبو ماں باقاعدہ "آپا جی" بن گئیں۔ بڑے پیار سے وہ ہر ایک کو بغیر گھور کر

جوڑ کے پڑھاتی۔ دل تو سدا کا پھوڑا تھا دکھتا ہوا۔ جس کا دل دکھا ہوگا وہ کسی کو کیا کچھ کہے گا! سارے بچے ایسے ہل مل گئے گویا آپا بی سے برسوں کی جان پہچان ہو۔ پڑھانے کا وقت صبح دس بجے سے پانچ بجے تک تھا۔ مگر ادھر صبح ہوئی نہیں کہ اکم دو دو تین تین بچوں کی ٹکڑیاں آنی شروع ہوجاتیں اور سب آنگنے کے دیوان خانے میں بیٹھے جاتے۔ اور شام کو پانچ تو کیا سات آٹھ بھی بج جاتے تو بچے جانے کا نام نہ لیتے۔ اتنے دل جمعی سے پڑھنے لگے اور گھروں کو جاتے وقت اتنے ڈھیٹ بن جاتے کہ نجماں کو مجبوراً رات کو بھی پڑھانا پڑا۔ جس میں دادی بی کی کہانی بھی شامل ہوتی۔

اتنی مصروفیت میں بھی نجماں کو کوئی خیال ایسا بھی تھا کہ کبھی بھلائے نہ بھولتا۔ اور یوں جیسے وہ بھی نماز روزے کی طرح زندگی کا ایک اہم فریضہ ہو، آپ ہی آپ وہ چھجے پر جا کھڑی ہوتی اور ہولے ہولے پکارتی:۔

"کاگا رے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا"

کوے دھوم مچاتے:۔ کائیں، کائیں، کائیں — مگر وہیں بیٹھے رہتے۔ بالم کا سندیسہ کبھی نہ آیا اور اب تو نجماں کی آنکھیں بھی روتے روتے دھندلا گئی تھیں۔ ایک طرف آنسو تھے، ایک طرف انتظار — کس کا انتظار ہے یہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ بس رو دے جاتی اور پکارے جاتی:۔

"تو — تو اڑ جا — کاگا رے کاگا —"

مگر کووں کو چھجے کی منڈیر ایسی بھائی تھی کہ اڑنا تو دور رہا پر بھی نہ پھڑپھڑاتے۔

"ہا — بیچاری شہزادی —! بڑی کرموں جلی تھی بیچاری۔ راجہ رانی کی تو کبھی بنی نہیں۔ ارے جس کے سر پر باپ کا سایہ ہو اسے کاہے کا ڈر —؟ یہ چھتر چھاؤں تو ایسی ہوتی ہے کہ ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ مگر راجہ تو بس اپنی ہی جگہ مست تھے، انھیں کیا فکر! بیچاری باپ کے ہوتے بھی یتیم ہی تھی —"

"وہ کیوں دادی بی —؟" جماعت کی کوئی معصوم سی بچی پوچھ بیٹھتی۔

دادی بھی گھورتیں — "پھر ٹوکا دیا نہ مجھے —! ارے راجہ کی پسند کی رانی کہاں تھی؟ بس تبھی سے یہ کھوٹ چلی آتی تھی۔ پھر دادی بی اس خیال سے بیگانہ کہ سامعین ننھے منے بچے ہیں بکے چلی جاتیں:۔

" اور کمرٹ بھی ایسی ویسی تھی! ارے اتنے سید سے دو چار بچے ہی کیسے ہو گئے ، سو ہو گئے ، ورنہ اب تو یہ حال تھا کہ راجہ جی اپنی رانی سے باقاعدہ ہاں بہنوں جیسا برتاؤ رکھتے ہاتھ تک نہ لگاتے۔ ارے بازو تک نہ بیٹھتے تو بچوں بچوں کا کیا سوال ۔ ! مزید ثبوت کو وہ سب کی طرف گردن گھما گھما کر دیکھتیں اور بولتیں :۔

" ارے پاس تک نہ بیٹھیں گے ہی نہیں تو پھر اولاد کیسے پیدا ہو جی ۔ ہاں تو پھر یہ دوری اتنی بڑھی ۔۔ اتنی بڑھی کہ راجہ باہر کے ہو کر رہ گئے اور رانی اندر کی ۔ اب ماں کو جتنا درد بچی کا تھا اتنا باپ کو کہاں تھا ۔ ! ماں گھلتی رہتی گر فکر دور نہ ہوتی ۔

" ہاں ، تو پچھلی بار میں نے کہاں تک کہی تھی کہانی ۔۔ ؟

" ہاں ، تو اللہ کا نام بڑا ، اس کا کام بھی بڑا ۔ ایک دن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ایک مصیبت کا مارا کوئی شہزادہ ، شہزادی کے محل تک آنکلا ۔"

شجو ماں ، بوکی چوتھی بچی کے لئے ان کے موزے بُن رہی تھی ، اکدم چونک پڑی ۔ سلائیاں اور ان کا گولا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا ۔ اس کا سارے حیرت کے کھلا رہ گیا تھا ۔ کیا شہرِ ممنوع کے دروازے اس کے لئے ۔۔۔ شہزادی کے لئے کھل سکتے ہیں ۔۔ !

" تو دربان نے اُسے اطلاع دی کہ کوئی شہزادہ مصیبت کا مارا آیا کھڑا ہے اور شہزادی کی خدمت میں باریابی چاہتا ہے ۔ شہزادی نے اسے خاص اپنے حرم میں بلوایا ۔"

" اور اس نے شہزادے سے پردہ نہیں کیا ۔۔ ؟ " عائشہ بول اٹھی جواب دسویں میں تھی ۔ اور اسے بار بار سینے پر دوپٹہ رکھنے کی تاکید اور گلی میں نکلنے کی ممانعت کی جاتی تھی ۔

" اے تو بی بی اب شہزادی خود جو اتنی سمجھدار تھی ، بھلا آگے پردے جوڑے کی کیا ضرورت ؟ ہاں تو بھئی شہزادی نے شہزادے کو بلا ہی لیا ۔ گر شہزادی کو یقین نہ ہوا کہ یہ شہزادہ ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ اس کے بدن پر بڑے بڑے کپڑے تھے اور سفر سے اس کی صورت بھی بڑی ہونق ہو گئی تھی ۔ بال بھی بڑھ گئے تھے ۔ شہزادہ تو کیا ، ہاں ۔۔ ! صورت سے قیدی ضرور لگتا تھا ۔"

دادی بی نے خود ہی زور کا قہقہہ لگایا اور سب کی طرف دیکھا ۔ بچے بھی ہنسنے لگے ۔ گر شجو ماں منہ کھولے کہانی کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتی رہی ۔

" اب تم جانو شہزادی تو شہزادی سو عقلمندوں کی ایک عقلمند ۔ اس نے سوچا :۔ اور نہیں ۔۔ ایسے نہیں ۔ اس کا امتحان لیا جائے کہ واقعی یہ شہزادہ ہے ۔ بس تو شہزادی نے

نوکروں کو حکم دیا کہ راتوں رات کپڑا خرید لائیں ـــ ہر ہر قسم کا کپڑا۔ اور اس کے گدے تیار کریں۔ بس سبھی نوکر خریدی کے لئے دوڑے۔ پورے شہروں میں ستر رنگوں کا کپڑا ملا۔ جھٹ پٹ اس کے گدے تیار کئے گئے۔ شہزادے کو نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے گئے اور پھر شہزادی نے بطور خاص یہ اہتمام کیا کہ اپنے ہاتھوں بستر لگوایا ـــ معلوم ہے کیسا بستر ـــ ؟"

دادی بی کی کہانیوں میں دل بھر کے ناقابلِ یقین باتیں ہوتی تھیں۔ پھر بھی سب بڑے چاؤ سے سُنتے۔

"ہاں تو بستر کیسا تھا ـــ ؟ معلوم ہے شہزادی نے ایک کے اوپر دوسرا، دوسرے پر تیسرا ـــ تیسرے پر چوتھا ـــ ایسے ستر گدے ایک پر ایک رکھوا دیئے اور ان کے نیچے چنے کا ایک دانہ اٹھا کر کے رکھ دیا۔"

"چنے کا دانہ وہ کیوں ـــ ؟" چھبو حیرت سے بولا۔

"ارے آگے سونا۔ بیچ بیچ میں سنہ کیوں اڑاتے ہو رے ـــ ؟ تو بھئی شہزادی نے چنے کا دانہ ستر گدوں کے نیچے رکھ دیا۔ رات ہوئی، سب سو گئے۔ صبح ہوئی، شہزادی نے منہ ہاتھ دھویا، کپڑے بدلے اور شہزادے کی خبر لینے اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ پوچھا:۔

"کیوں جی، آپ کی رات کیسے گزری ؟"

شہزادے نے سر جھکا کر جواب دیا:۔

"جی رات تو آپ کی بدولت اچھی ہی گزری، ـــ مگر ..... "، اور اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔

"کیا ـــ ؟" شہزادی نے پوچھا۔

"مگر کوئی چیز رات بھر میری پیٹھ میں چبھتی رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ سے میری پیٹھ میں نیل بھی پڑ گیا ہوگا۔"

شہزادی نے اس کی قمیص الٹ کر دیکھی تو واقعی پیٹھ نیلی ہو رہی تھی تب شہزادی کو یقین آگیا کہ واقعی یہ سچا شہزادہ ہے۔ کیونکہ شہزادے اور شہزادیاں ہی اتنے نازک مزاج ہوسکتے ہیں کہ ستر گدوں کے نیچے سے بھی ایک چنا ان کے نیل ڈال دے۔

جب شہزادی کو پتہ چل گیا کہ یہ سچ مچ کا ہی شہزادہ ہے اور اس نے جھوٹ موٹ نہیں کہا تھا تو شہزادی کے دل میں شہزادے کی محبت پیدا ہوگئی۔ شہزادی خود ابھی کم عمر کی تھی اور

شہزادہ بھی خاصی بڑی عمر کا تھا۔ تو تم جانو دھان کا پودا گھٹنے گھٹنے پانی ہی میں پروان چڑھتا ہے۔ ادھر شہزادی نے یہ چلن اختیار کیا تھا کہ چوڑیاں، زیور اور رنگ برنگی کپڑے دیئے سب ترک کر دیا تھا۔ گویا جوگ اُٹھائی تھی۔ اب تو اس نے رنگ برنگی جھما جھول کپڑے پہنے، چم چمانی، کھنکناتی چوڑیاں پہنیں، جھومر لگایا۔ شہزادے نے بھی یہ سب کچھ دیکھا اور اس وقت تو بڑا مزا آیا جب ......"

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بہت تیز لہجے میں بولے:۔

"اجی بھائی جان سُنتی ہو! غور کریں تو پھر غضب ہیں۔ یہ تو اپنے والے ہیں نا۔ کیا کیا اُڑاتے پھر رہے ہیں۔ سالے کہتے ہیں ....." ایکدم وہ رک سے گئے۔

"کیا کہتے ہیں —؟" بڑی بی نے ہولا کر پوچھا۔

دیوان خانے میں کری پر شجو ماں انھیں کی طرف دیکھ رہی تھی، آواز نیچی کرکے بولے:۔

"کہتے ہیں ربو سدا اپنے میکے رہتی ہے اور وہاں اس کے میاں کا بھی آنا جانا ہے۔"

اور وہ معنی خیز انداز میں خاموش رہ گئے۔

"اور وہ تمہاری میری بہن —" وہ پھر بول اُٹھے۔ "کینی کھڑکی، کستی عمر شجو ماں کی آنکھوں میں یہ حلقے کیسے پڑے ہیں۔ ؟ اور کھانا آخر اسے نام کھاتی ہے۔"

"میاں —!" بڑی بی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا، "اللہ ہی ان سے سمجھے تو سمجھے۔ مگر تمہیں کہو میری شجو ماں ایسی ویسی لڑکی ہے —!"

"ارے نہیں جی بھابی جان —! میں یہ کب کہہ رہا ہوں —؟ میں تو تمہیں ذرا سا تا چاہ رہا تھا کہ تمہارے والے ایسے گنوں ہیں۔"

"میاں —!" بڑی بی پھر بڑے سہمے ہوئے لہجے میں بولیں، جس میں گڑگڑاہٹ بھی شامل تھی — "بلا سے عمر ڈھل گئی۔ آج بھی کوئی ملے تو ہاتھ پیلے کر دیں اس کے۔ تمہاری نظر میں کوئی نہیں —؟"

بھائی جان، بھلے کو شجو ماں کوئی حرامی پلہ ہی جن ڈالتی تو اتنی خرابی نہ ہوتی، مگر منگنی ہوئی مٹی کی بات ٹوٹ کر تو — اونہوں، یہ تو بڑی ناممکن سی بات ہے۔"

جلتے تیل کی بوندیں سی شجو ماں کے کانوں میں گر رہی تھیں۔

"اوہ خدا ـــ یہ جوانی! کیا میں اب بھی جوان ہی ہوں کہ سال کرتی ہوں کہ لوگ یوں نام دھرتے ہیں"
اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ ڈھلتا سورج زبانِ حال سے کہہ رہا تھا۔ "بس شام ہوا ہی چاہتی ہے۔" پھر یہ دنیا ـــ اور دنیا والے ـ!

للی نے ایک بار پھوپی بی کے رنڈاپا چڑھایا تھا۔ پھوپھیاں راتوں رات پھٹ پٹ ہو گئے تھے۔ اماں بی نے پھوپھی بی کی کچ کچاتی ہری ہری چوڑیاں مار کے پھوڑی تھیں۔ گلابی ریشم کی جھلا ساڑی نوچ کر پھوپی کی موٹی سی سفید چادر اوڑھادی تھی۔ کالی کالی پوت کا لچھا کھینچ کر گلا ٹونا سونا کر دیا تھا اور کلیاں کروا کروا کے مسی کی دھڑی چھڑوائی تھی۔

"میں بھی رنڈاپا چڑھاؤں گی۔"

"مگر وہ کہاں ہے، جس کے نام سے مجھے رنڈاپا اور رنڈاپے کی ویرانی مل رہی ہے۔!"
اس نے بھرے دل سے سوچا۔ پچھلے پہر اٹھ کے آنگن میں جاکر اس نے پتھرے کا سی کاسنی چوڑیاں کری کری کر ڈالیں۔ بالوں میں گلابی پراندہ تھا، اسے جھاڑ پھینکا۔ پھر کمرے میں اکرو غرانی اوڑھنی اتار کر سفید کفنی جیسی موٹی ململ کی اوڑھنی اوڑھ لی۔

اتنا ہی ہوتا تو بس نہ تھا، مگر دوسرے دن سارا کیا دھرا اپنی جگہ رہ گیا۔

نصیرالدین کا بھانجا بڑا اکھڑ تھا۔ پڑھنے لکھنے میں بڑا بودا۔ اسکول میں چھپن مرتبہ تو بٹھایا تھا۔ مگر اٹھ اٹھ کر بھاگ آتا۔ نصیر میاں باجری کے بھٹوں کی طرح اسے دھناتے دھنک گئے۔ آٹھ چوروں کی مار اس اکیلے کو پڑتی، مگر وہ الف بے کی تختی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ نو برس کا ہو رہا تھا۔ نو برس تو بچے پوتھی پانچویں بھی پاس کر لیتے ہیں۔ ننھو ماں کی میٹھی زبان کی ہر جگہ تعریف ہو رہی تھی کہ دو کلاسیں ہو رہی ہیں۔ اس نے بھائی سے کہا۔—

"بٹھا دے جاکے شاہجہاں بیگم کی جماعت میں۔ لگ جائے گا راستے سے۔"

نصیر میاں کے دل کو بھی بھاگئی۔ ستھرے صاف کپڑے پہنائے۔ بغل میں بستہ دبا کے ننھو ماں کے گھر آئے۔ یہ دالان والے اپنی جماعت کو پڑھاتی بیٹھی تھی۔ دروازے پر دستک دی۔ ننھو ماں نے ایک منٹ سب بچوں کو ہاتھ بتا کر خاموش کیا، اور دستک دینے والے کو کہا:—

"اندر آجاؤ۔"

آگے آگے رونق میاں اور پیچھے پیچھے ماموں نصیر میاں۔ ایک دم ننھو ماں سمٹ بٹا کر کھڑی ہوگئی۔ الف بے کا قاعدہ ہاتھ سے گر گیا اور نگاہیں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔ سفید آنچل

سر پر لرز رہا تھا اور وہ سہمی سہمائی کرسی کا ہتھا تھامے کھڑی تھی۔

"یہ ...... ب ...... ب ...... بچہ پڑھتا ہی نہیں ...... ب ... بالکل... وہ ہے۔" نصیر میاں کی زبان تالو سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہی تھی۔

"جی ...... م ...... م ... میں پڑھاؤں گی۔ یہاں تو بھی ڈھیٹ آتے ہیں۔" وہ گھبرا کر ہنس پڑی۔

نصیر میاں بھی مسکرا دیئے۔ "جی ہاں — ذرا دھیان سے پڑھا دیجئے گا۔ آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔" اور وہ سلام کرکے، جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گئے۔

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے!"

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے!!"

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے!!!"

نجماں کے دل سے ایسی خوشی پھوٹی کہ وہ پاگل ہوتے ہوتے رہ گئی۔

"ہاں بچو، تم نے بھی میری تعریف سنی ہے۔!"

"ہاں آپا جی — آپ بہت — بہوت اچھی ہیں۔" یہ سب آگے پیچھے بول اٹھے۔

یہ نصیر میاں بوڑھے، اب تو پچپن کے ہی تھے سے تھے، مگر جوانی میں ان کا بڑا زور تھا۔ جانے کون سی عینک آنکھوں پر چڑھائے بیٹھے تھے کہ کوئی صورت سی کو نہ بھاتی۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس کے اوپر ہونے آئے مگر اب تک بھی اوم بنے کسی گم نام ہوا کو گھورتے رہتے۔ ہزاروں ہی بھلی بری صورتیں آنکھوں سے گزری ہوں گی۔ مگر دل پر کوئی نہ چڑھی۔ بڑی بی کے قریبی سگوں میں آتے تھے۔ بڑے پڑھے لکھے تھے۔ ان کی بیٹھک میں ایسی بڑی بڑی آڑی ترچھی کتابیں تھیں کہ ضرورت پڑنے پر چاہو تو تکیہ بنا کر لے لو۔ کتے والے سید صاحب کے بیٹے تھے۔ قریبی عزیز داری تھی مگر آنا جانا سب موقوف تھا۔ بات کچھ بھی تو نہ تھی۔ نصیر میاں کے باپ علی گڑھ جا کر پڑھ آئے تھے۔ اس زمانے میں علی گڑھ جانا لندن جانے سے کم نہ تھا۔ اور پھر یہ یوں ہی کورے تو نہ چلے آئے تھے۔ ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کی لمبی چوڑی ڈگری ساتھ لائے تھے۔ اور ایک فوٹو بھی تھا، کالا کالا جبہ سا پہنے، سر پر ترچھی سی ٹوپی لگائے۔ پورے خاندان والوں میں وہ فوٹو گھومتا پھرا، اور کئی لوگوں نے تو گرہ اس بھی باندھ لی، مگر بیچ میں یہ کتے آن پڑے۔ علی گڑھ سے "آتے آتے اللہ میاں اپنے ساتھ ایک ولایتی کتا ادھکتیا لے آئے تھے۔ جو ان کے کسی انگریز دوست

نے بطور تحفہ دیئے تھے۔ یہ بڑے بڑے جھاڑ نے کہ دور سے دیکھو تو شہر سے نظر آتے۔ اس زمانے میں پورے خاندان پر دادا حضرت کی حکومت تھی۔ نماز روزے کے وہ بڑے پابند تھے دو دو حج کیئے وہ الگ۔ چار پانچ روزے تو کبھی نہیں گئے تھے۔ ہر جمعہ کو روزہ ہوتا۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ میاں انور اپنے ساتھ کتے بھی لگائے ہیں تو پہلے پیار دلار سے سمجھایا کہ "دیکھو میاں جس گھر میں کتے ہوں رحمت کے فرشتے نہیں اترتے۔ فضول ناپاک ہوتی ہے۔ بڑا نجس جانور ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے" مگر انور میاں نے ایک نہ سُنی۔ بس دادا حضرت کو تاؤ آگیا۔ انور میاں کا گھر میں آنا جانا ہی بند ہوگیا۔ اب یہ بات لتنے غصے۔ بچے کی بھی نہ تھی، مگر غصہ میں تو ایک فرشتہ بھی شیطان بن جاتا ہے۔ دادا حضرت نے جڑ ہی اکھاڑ پھینکی۔ اور ان کو گویا ذات باہر کر دیا۔ انور میاں بھی ڈھن کے، زیادہ صحیح لفظوں میں اپنی ضد کے، ایسے پکے تھے کہ ذرا بھی تو اثر نہ لیا اور اوپر سے عبدالکریم کی بیگم بیاہ لائے۔

انور میاں کا جب بھی ذکر نکلتا تو بڑے گھر والے طعنے سے۔ "اجی وہی کتے والے سید انور" کہہ کر یاد دلاتے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ سُنتے سُنتے انور میاں کا نام ہی "کتے والے سید صاحب" پڑگیا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ کتے تو پالے، مگر کیا ہے جو اپنے معمولات میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ دیوان خانے کے باہر ہی ایک چبوترہ سا بنوا لیا گیا تھا، جہاں دن بھر یہ دونوں کتا کتیا بیٹھے آنے جانے والوں کی پرچھائیاں کرتے تھے۔ یوں تو علی گڑھ سے انگریزی پڑھ آئے تھے۔ ڈھیر ساری کتابیں چاٹ ڈالی تھیں، مگر تھے وہی پکے سیدھے مسلمان۔ اور خود ہی تو بولتے،۔

"او میاں یہ علم ہمیں یہ تھوڑی ہی سکھاتا ہے کہ اپنا دین اور مذہب چھوڑ کر عیسائی بن جائیں"

یوں پہننے کو کوٹ پتلون بھی کبھی کبھار پہن لیتے، مگر مر تے مر گئے، وضع داری نہ چھوڑی۔ وہی شرعی پاجامہ، کمل آستینوں کا کرتا چار کلی والا، سر پر رام پوری کالی ٹوپی اور ہاتھ میں تلابوا کی دی ہوئی چھڑی۔ صبح کی نماز بھی شاذ ہی قضا ہوتی۔ ہاں عشار کی نماز میں اکثر غچہ مار دیتے بولتے :- "کھانے کے بعد کم بخت کسی کام کا نہیں رہ جاتا میں۔ بڑی گنگی آجاتی ہے آنکھوں میں۔"

انہی کی اولاد یہ نصیر میاں تھے۔ جیسا بیج ویسا پودا۔ ان کے دماغ میں بھی ڈھیر سارا علم بھرا پڑا تھا۔ عمر کمال کی کہاں پہنچ رہی تھی مگر اب تک کنوارے سانڈ بنے پھر رہے تھے۔ باپ بڑبڑاتے :-

اے کم بخت تجھے تیرے علم نے یہی سکھایا ہے کہ سونگھ کر چھوڑ دے۔"

خنس کررہ جاتے۔ باپ تو اس عمر میں چھ چھ بچوں کے باپ بھی ہو گئے تھے، یہ ابھی تک پتنگیں اڑاتے پھرتے تھے۔ کہتے تھے:۔

"جب تک کنوارے ہو، بچے ہو ۔! شادی ہوئی کہ بڑھاپے نے آگھیرا"۔ اپنے بھلائے اب تک بھی بچے ہی بنے پھرتے تھے!

شام کو چار بجے رؤف میاں گھر لوٹنے لگے تو شجو ماں نے کہلا بھیجا:۔

"اپنے ماموں میاں کو سلام کہہ دینا ہمارا"۔ رؤف میاں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔

یہ سلام کلام یہاں تک بڑھے کہ شجو ماں جان جان کر پہاڑے بھولنے لگیں، حساب غلط کر کر جاتیں تو پھر نصیر میاں ہی ایسے ہوتے جو غلطیاں نکالتے۔

"واہ بھئی واہ ۔۔ یہ کوئی حساب ہوا۔ سولہ دونی چھتیس ہوتے ہیں آپ چھتیس بتا رہی ہیں"۔ یہ جھینپ کر رہ جاتی۔ مسکراہٹوں بھرے داشتن اٹھ گیا تھا۔ جی کھول کر مسکراتی قہقہے لگاتی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی، شجو ماں سوچتی، کہ ہزار منتوں سے پکارنے کے باوجود ایک بھی کوا تو نہ اڑتا تھا!

اور پھر بڑی انوکھی سے بات یہ بھی ہوئی کہ شجو ماں نے بقرعید پر اپنی پسند سے ہری چوڑیاں پہنیں، ان کے آگے پیچھے سرخ رنگ کے گوٹے چڑھوائے، اور پیادار کے سمدان کو جب سلام کیا تو اس نے بھی دل بھر کر دعائیں دیں۔

"اللہ سہرے کے پھول کھلائے، دلہن بنائے، جی کے ارمان نکالیں۔ ہمارا بھی بھلا ہو گئے"۔

اور شجو ماں جو کسی کے بھی منہ سے یہ دعائیں سن سن کر سفید پڑ پڑ جاتی تھی، شرم سے تپ کر دودھ ابلی کاجل کی طرح لال لال ہو گئی۔

اور بڑی بات یہ کہ شجو ماں، جو پورے خاندان میں گھر گھسنی مشہور تھی، خیل شیل کر ماں سے کہتی۔

"اماں ۔ آخر انو چچا نے کتے پال لیے تو کیا گناہ کر ڈالا تھا؟ مذہب تو نہیں بدل لیا تھا نا! اب کرنے والے تو مر کھپ کر مٹی میں مل گئے۔ فضول آپس کی برائی سے کیا فائدہ۔ آپ ان کے گھر آتی جاتی کیوں نہیں ۔۔؟"

نصیر میاں جو جاڑے کی خبر لینے آتے تو گھنٹوں خبر ہی لیتے رہتے۔ کبھی کھانا کبھی چائے اور کبھی یہ نہیں تو خالی پان ہی سہی۔ شجو ماں، جو ساری دنیا سے منہ موڑے راہبہ بنی بیٹھی تھی، پھر آدم حوا کی ہنستی گاتی دنیا کو پلٹ رہی تھی۔

اور اب تو ایسا بھی ہوا کہ نصیر میاں کو کھانے پہ روک لیا اور خود بھی کوئی میٹھا بنانے لپک پڑی۔

بات چیت کا موضوع بدلتے بدلتے اس پر بھی آگیا:۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی ۔۔۔؟"

"پسند کی کوئی لڑکی ہی نہ ملی۔ اور جب لڑکی مل گئی تو اپنی عمر ڈھل گئی۔ مگر کوشش کریں گے کہ تقدیر بدل جائے" نصیر میاں مسکرا کر بولے:۔ "آپ بھی دعا کیجئے۔"

صاف اشارہ تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔! ننھو ماں شرما گئی۔ منہ تپ گیا۔ آنکھیں اٹھا کر بولی:۔

"آپ کوشش کیجئے، میں دعا کروں گی آپ کے لئے۔"

پورے خاندان میں اڑ گئی کہ رزاق میاں والوں اور کٹے والے سید صاحب کی آپس میں میل ملاقات ہو گئی۔ اور جو ذرا سنسنی خیز خبریں سننے اور سنانے کے دلدادہ تھے انہوں نے یہ بھی اڑا دیا کہ نصیر میاں گھنٹوں رزاق میاں کی جوان بیٹی، جو ان بیاہی ہے۔ کے یہاں جا جا کے بیٹھتے ہیں۔ اب ان کے وہیں بستر جاتا ہے۔ سنا ہے کچھ بات بھی ہونے والی ہے۔

وکہ بات بھی ہونے والی تھی، گرمی تو کنواری ہی ننھو ماں۔ ان نے اونچ نیچ سمجھانے کے لئے الفاظ تھوڑے ہی، گڑھے نہیں۔ ننھو ماں ایسی ویسی عمر اور چال کی تو تھی نہیں کہ سمجھانے بجھانے کی ضرورت پڑتی۔ بولتیں بھی کیا! پھوپھی دبی زبان سے کبھی کبھار کہہ دیا کرتیں:۔

"زمانے والوں کے منہ کھلے ہیں بیٹی۔ ہماری بچی کنواری بیاہی بھری، دو بچوں کی ماں، صاف لگانی بجھانے والوں نے کہا انو میاں سے ہنستی ہیں۔ انو میاں ان کے رشتوں کے بھائی آتے تھے۔"

ننھو ماں نے سنا ضرور، مگر یہ نہ سمجھا کہ یہ صاف ان پر ہی چوٹ ہے۔

نصیر میاں بھی مسکرا مسکرا کر بات کرتے۔ تعلیم یافتہ تھے، ڈگری یافتہ تھے۔ ہزاروں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دل کے کھوٹے نہ تھے بیچارے، ورنہ ہزار بار تو کنواری تنہائیاں میسر آئیں۔ کوئی جیسے ہوتے تو کچھ تو نیت میں فتور آتا۔ مگر انہوں نے تو کبھی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ پان بھی یہ بنا کر دیتیں تو کہتے:۔

"وہاں میز پر رکھ دیجئے۔ ابھی حساب میں الجھا ہوا ہوں۔"

نصیر میاں کی قدر و قیمت انہی باتوں سے ثمو ماں کے دل میں اُگتی ہو گئی تھی۔
ثمو ماں کی دھندلائی آنکھیں، جو نیند سے بیگانہ تھیں۔ اب سپنے دیکھتیں۔ ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا شہزادہ ان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ یہ دروازہ کھولتی ہیں۔ وہ چپ چاپ کھڑا مسکراتا ہے۔ پھر یہ مسکراہٹ اتنی پھیل جاتی کہ خواب ٹوٹ جاتا۔ پھر نظر آتا کہ جیسے پر کھڑی کووں کے پیروں میں سونے کی پائلیں باندھ رہی ہے اور ہزاروں کوے اپنے کالے پر سمیٹتے کائیں کائیں کرتے اڑے چلے جا رہے ہیں۔ پیروں کی پٹ پٹ اتنی تیز ہوتی کہ ثمو ماں کی آنکھ کھل جاتی۔

شہرِ ممنوع

دادی بی نے ادھر کئی دنوں سے کہانی نہیں سنائی تھی۔ آج وہ پھر پاندان گود میں لئے کہانی سنا رہی تھیں۔

"ہا ___ بیچاری شہزادی۔ تھی نا نصیبوں کی پوری۔ شہزادے کو ہر ہر طرح ناز و نعمت سے رکھا، کھلایا، پلایا، اس کی محبت اپنے دل میں پالی۔ اور آخر کو وہ دغا دے گیا۔ پیاروں پٹیا کبوتر کی طرح پھر سے اڑ گیا یہ کہہ کر کر: ___
"چین دیش کی شہزادی نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تیرے لوہے کے جوتے گھس جائیں گے تب شادی کروں گی۔ اب اس کے جوتے سفر میں گھس گئے تھے۔ چلو شہزادہ چین دیش کو چلا گیا اور کہانی ختم ___!"

آج اسحاق چچا کلائمیکس میں گڑبڑ پیدا کرنے عین موقع پر آ ٹپکے۔ بڑے آرام سے آ کے ڈولی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بولے: ___
"کیا زور دار شادی کی ہے۔ دلہن والوں نے مسہری کے ڈنڈے سونے کے دیئے اور سونے کے پازیب کے علاوہ پاندان بھی سونے کا دیا۔"
"کس کی شادی کا ذکر ہے میاں ___؟" بڑی بی چھالیاں کترتی پڑی تھیں کروٹ بدل کر بولیں۔
"ارے آپ کو نہیں معلوم! نصیر میاں کی شادی سے تو آ رہا ہوں۔"

"ہائیں!" بڑی بی بی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ "نصیر میاں کی شادی؟ ہمیں تو رقعے بھی نہیں آئے گر......."

اسحاق میاں نے بن کی زور دار گالی دی۔ وہ کتے کے بچے حمید میاں کے ہاتھوں میں انتظام تھا نہ۔ وہ تو ہمیں کالے کماتا ہے۔ مجھے تو جمیل میاں راستے سے پکڑ لے گئے۔"

"کس کی بیٹی ہے؟" بڑی بی بی نے ڈوبتے لہجے میں پوچھا۔

"خیر کیف کی ہے۔ نواب جلال کی پوتی ہے نا۔ اتنے دنوں سے یہی تو جھنجٹ چل رہی تھی۔ بڑی کوشش سے ہوا یہ پیام --- !"

"ہاں تو بھئی، وہ کہانی ختم ہوئی۔ اب یہ دوسری سنو --- ایک تھا......."

"دادی بی بی!" آنسو بھری آنکھیں لئے، دونوں ہاتھوں سے اپنا دل پکڑے نجو ماں پوری طاقت سے چلا اٹھی، "آپ یہ کہانیاں مت کہا کیجئے۔ آپ اپنا وقت الگ برباد کرتی ہیں اور دوسروں کی زندگیاں بھی تباہ کرتی ہیں۔"

نجو ماں اتنی زور سے چلائی تھی کہ بچوں نے سہم کر اپنے چہرے قاعدے کی آڑ میں کر لئے۔

"اوئی --- میں نے کس کی زندگی تباہ کی ---؟ کہانی جیسی کہانی تھی، شادی --- اے لو اور سنو" اور وہ منہ میں پان رکھ کر کٹ کٹ چھالیہ کاٹنے لگیں۔

اک دم نجو ماں کے سارے بال سفید پڑ گئے۔ چوڑیاں آپ ہی آپ ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئیں۔ آنکھیں دھندلا گئیں اور گالوں پر جھریاں پڑ گئیں۔ اور پھر کانپتے ہاتھوں سے نجو ماں نے بغدادی قاعدہ اٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز سے پڑھانے لگی، --

"پڑھو میرے بچو --- !

الف سے انار

بے سے بکری

تے سے تلوار ---"

∴ ∴

www.taemeernews.com

کانچ کا دل

رانی دلہن پورے دنوں سے تھی۔

بی ساس کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو گیا تھا۔ بڑے گھر میں یہ کوئی پہلا زچگی جاپا تو تھا نہیں جو یوں سسپاں پہول کی طرح کھِل پڑتیں۔ مگر یہ بھی تو قسمت کی خوبی ہی تھی، ناک کو پر چلے کے چار بیٹوں میں سے کسی نے تو اماں بیگم کو پوتے کی دادی نہ بنایا۔ لے دے کے اچھائی، صفائی اور گھر بھرے میں لڑکیاں ہی لڑکیاں بھرا کرتیں۔ اماں تو رو رو کر سوچتیں: ہے ہے، جس بہو کو دیکھو ٹپاٹپ بیریوں کی طرح بیٹیاں جنے جا رہی ہیں۔ آخر ان کا کیا ہوگا؟ اور خاندان کا نام کیسے چلے گا؟" مگر وہ صرف سوچ تو سکتی تھیں، لیکن لڑکیوں کو پیدا ہونے سے روک کہاں سکتی تھیں۔

دھنیا دائی محلہ بھر پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ جہاں کسی نئی نویلی پر اس کی نظر پڑی اُس نے جھٹ وہیں بتا دیا:

"یہ کہوں بہو پوت جنے گی۔"

اگر کسی کو بیٹی ہونے کی بات سنا دی، تو کیا مجال جو بیٹا سر اُٹھا کر چلے۔ وہ تو چال دیکھ کر بات پہچانتی تھی۔ خود اس کی اپنی بہو نے ایک کے بعد ایک، چھ بیٹے پیدا کر ڈالے تھے۔

میاں کو بٹیا رانی کا وہ ارمان تھا کہ نچلے والے بیٹے کو سارنگین کپڑے پہنا کر زیور سے لادے رکھا۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں، اور تو اور جھن جھن کرتی جھانجھیں بھی پیروں میں ڈال دیں۔ بڑی بوڑھیاں ٹوکتی بھی تھیں کہ اس کی تو عقل اُلٹ گئی ہے۔ بچپنے ہی سے اُسے بیٹی کا سوانگ دے رکھا ہے، بھلا اس پر کیا اثر پڑے گا؟ ساری عمر ان کے کولے سے لگا ہانڈیاں دھوتا اور روٹیاں بیلتا رہے گا۔ بھوان کے طعنے خوب سمجھتی تھی، مگر ماتا کے ارے جی کو نسی تھی سی کل کی لگن تھی تو پوری بھی کیسے پڑتی؟ مگر اگلے برس جب بہو کو حمل ٹھہرا اور وہ سہم سہم کر قدم اُٹھانے لگی اور اپنی گسلی پھر پھر کر کچّے پکّے پر چبانے لگی تو ساس نے ایک دن اس کے چہرے کا رنگ دیکھ کر کہہ دیا:۔

"یں کہوں اب ننھے کے انگ پر سے ریشم اور زیور اُتارنے"

بہو نے چکرا کر ساس کو دیکھا تو ساس ہنسی اور بولی:۔ "اور کیا۔ یہ دیکھ، رات کو نیند میں، میں نے تیرے گلے سے گھر اتاری اور تو کسائی تک نہیں۔ نیند ایسی ٹوٹ کر آئے تو بیٹی کو ساتھ لاتی ہے۔ اور پھر تیرا پیٹ تو دیکھ، ابھی سے پھیلا پھیلا سا ہے۔ بیٹا پیٹ میں رہے، تو پیٹ اونچا رہتا ہے۔ ماں باپ کی ناک اونچا کرنے والا دنیا میں آنے والا ہوتا ہے نا، اس لئے"

"اچھا!" بہو ذرا خفگی اور ذرا شرارت سے بولی، "تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بیٹی ماں باپ کی ناک کٹاتی آتی ہے۔ کٹی ناک والی آتی ہے تو پیٹ بھی چپٹا چپٹا ہوتا ہے یہی مطلب ہے نا تیرا؟"

ساس تو اپنے چھ پوتوں کی دادی کہلائے جانے پر نازاں رہتی تھی، ہنس کر، بُرا منائے بغیر بولی:۔

"اور بتا تو سہی، کون بیٹی نے ماں باپ کا مان رکھا ہے؟ آئی بھی ہے تو مہمان کے سمان۔ جاتے جاتے آنکھ میں آنسو اور دل میں درد ہی تو دے کر گئی ہے نا بول جھوٹ کہتی ہوں؟"

بہو کچھ نہ بول پائی۔ مگر جب جاپے کے دن قریب آئے تو اس کو ساس کی رہ رہ کر بات یاد آتی رہی اور جب کچّے پکّے درد سے گزر کر اس نے بیٹی کا سانس لیا تو دادی ہنس ہنس

مگر محلے والیوں سے کر رہی تھی :۔

"اے میں کہتی چوڑی والی کو بلا لاؤ ری، گھر میں سہاگن براجی ہے ۔"

مگر رانی دلہن کے حق میں تو دھنیا دائی کی پیش گوئی بھی الٹی ہی پڑی۔ پیٹ دیکھو تو آسمان سے باتیں کرتا تھا اور جنم دیا بیٹی کو۔ ایک بار نہیں، دو بار نہیں۔ تین بار یہی ہوا۔ گھر میں لڑکیوں کی فوج تیار ہو رہی تھی۔ جٹھانیاں، دیورانیاں بھی لڑکیوں والی تھیں۔ اس خاندان میں ہی بیٹوں کا کال تھا۔ اماں کی بات تھی ہی نہیں۔ یاسین وِرد پڑھ پڑھ کر بیٹوں کی پیدائش کی دعائیں مانگیں بھی، مگر اُجڑے گھر میں کبھی تو دیا نہ جلا۔

اب کے پھر رانی دلہن پورے دنوں سے تھی اور ساس کا دل پھر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ دھنیا دائی کی بات پر یقین تھا نہ پیٹ کے ابھار نے انہیں امید بندھائی تھی۔ بس ان کا دل رہ رہ کر آپ ہی آپ کہتا تھا کہ کچھ بھی ہو اب کے ہوتا ہو گا ہی۔ مگر رانی کے دل پر تو ایسے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے کہ سورج کی کرن بھی انہیں چیرتی تو اجالا نہ ہو پاتا۔ اور اسے اطمینان یوں بھی تھا کہ کچھ وہی ایک تو بیٹیوں والی ماں نہ تھی، یہاں تو سارے کے ایک ہی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر چلے آ رہے تھے۔ نہ ساس نے کبھی رانی سے اپنی امید اور دل کی بات بتائی، نہ رانی ہی نے سوچا۔ ہاں مگر یہ ضرور ہوا کہ جب ایک رات سوتے سوتے رانی جاگی تو گھبرا گھبرا کر یہی کہنے لگی:

"ہائے اماں یہ کیسا درد ہے؟ پیٹ سے اُٹھ اُٹھ کر لہریں سارے جسم کو چٹکے لے رہی ہیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا۔"

"ایسا پہلے کبھی تو نہ ہوا۔" اماں کے سارے جسم نے کان بن کر بس اتنی ہی بات سُنی اور وہ بستر پر کل کے کھلونے کی طرح، پھرتی سے اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

کمرے میں اجوائن، عود اور دھوئیں کے غبار میں ملی جلی گرم گرم خون کی بو تھی اور رانی کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں کی لہریں۔ دائی نے اندھیرے سے اُٹھا کر ہاتھوں کو اونچا کیا اور جیسے آپ ہی آپ اس کی چیخ حلق سے یوں پھوٹی کہ رانی کا سارا جسم کانپ گیا۔

"اے دلہن میں کہوں بیٹا ہے۔ پورا کا پورا جیتا جاگتا بیٹا۔"

اور پھر "میاں" "یا ہاں" "اؤں ہاں" کی خوشگوار آواز۔ سچ مچ بیٹے کی آواز: "میں آ گیا ہوں آ جانے دے کر۔ نک اونچی کرنے والا، خاندان کا نام چلانے والا۔"

دائی پھر تائی سے باہر نکلی اور تیز تیز ہوئی اماں کے پاس پہنچی:-

۔اری بی بی، سنا تم نے؟ بیٹا ہے بیٹا! چاندی کے کنگن پہنوں گی، ــــ ہاں"

۔اری دھیرے بول نامراد۔ ساری عمر بچے جنتے گزری، اتنا نہیں معلوم زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو دم چھوٹنے لگتا ہے۔ وہاں تو آگے ہی ندیاں بہہ گئیں ہیں۔ اتنی خوشی کی خبر سنے گی تو جی کیا ہوئے گا۔ کتنے برسوں بعد تو آج اندھیرے میں چاند چمکا ہے"

اماں دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ رانی مسہری پر کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے، ایک ہاتھ زمین پر۔ دوسرا کولہے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ اب کے پھر لڑکی ہوئی ہے جس شرمندگی اور غم کے مارے اس نے منہ پھیر رکھا ہے۔ اب اسے میں پہلے تو یہ کہوں گی کہ لڑکی ہوئی ہے۔ اور جب وہ رونے پر آئے گی تو بتاؤں گی کہ وہ تو آج خاندان کی سب سے قابل عزت اور [illegible] احترام شخصیت بن چکی ہے۔ سنا رانی تم نے؟ سنا!"

ساس نے، جو پہلے ایک ماں تھیں، اور اب ایک پوتے کی دادی، دھیرے سے بہو کا شانہ ہلا کر اپنی طرف کھینچا۔ مگر رانی نے ساس کی طرف نہیں دیکھا۔ بیٹے کی طرف نہیں دیکھا۔ کسی کی طرف نہ دیکھا۔ اتنی ڈھیر ساری خوشی ملنے کے بعد وہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی تھی، سوائے اس کے کہ خود ہی خدا کے حضور شکر پیش کرنے چل دے!

رات کی سیاہی صبح سے بدلی، صبح کی روشنی پھر تاریکی میں روپوش ہوئی، مگر اماں اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ آنکھیں پھٹی ہوئیں اور سانس رکی ہوئی۔ وہ ساروں کی باتیں سن رہی تھیں، سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ مگر یوں کہ کسی بات کی خبر نہ تھی۔ جو ہر ایک نے آ آ کر ہلایا، پکارا، بہتیرا رلانے دلائے، مگر نہ ان کی آنکھ سے آنسو نکلا، نہ پلکیں ہلیں۔ جس جگہ رانی نے صبح کا بھرپور اجالا بکھیر دیا تھا اور اب وہاں تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بچیاں دعائیں دعائیں پھیر رہی تھیں اور بچہ پالنے میں پڑا روئے جا رہا تھا۔

"ہائے۔ میاں۔ میاں۔ بی میاں۔ میں یہاں ہوں۔ میں یہاں ہوں۔ تم کہاں چلی گئیں؟ تم نے میرے لئے دعائیں مانگیں، منتیں مانیں اور دعاؤں کا سہارا لیا، اور اب جب میں تم تک چل کر آیا تو تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اب میں کس کے پاس رہوں گا؟ کون مجھے بیٹھا رس

پلائے گا؟ اب میں کس کے پاس رہوں گا۔؟ سب مجھ سے دور دور بھاگ رہے ہیں۔ کسی نے میرے منہ میں کل سے دودھ کا قطرہ بھی نہیں ٹپکایا ہے امی۔ میں روتا ہوا آیا تھا کہ ہنسیوں اور مسکراہٹوں کی گود میں پلوں گا۔ مگر میرے آگے پیچھے، یہاں وہاں، اِدھر اُدھر آس پاس آنسو ہی آنسو ہیں، چیخیں ہیں، آہیں ہیں۔ بے نور آنکھیں ہیں اور تاریکیاں ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں، میں منحوس ہوں۔ میں نے اپنی ماں کو کھا لیا ہے۔ تائیاں، چچیاں مجھ سے دور دور بھاگ رہی ہیں۔ ایک دو دن کی بات تو نہیں، عمر بھر کا ساتھ ہے، کون دے گا؟ کون مجھے پیار سے گلے لگائے گا امی! دادی اماں مجھ سے بات نہیں کرتیں۔ ابو مجھے صرف دیکھ سکتے ہیں، سنبھال نہیں سکتے۔ پھر میں کہاں جاؤں؟ کہاں جاؤں؟ چیاں۔ چیاں۔ کی صداؤں"

رانی مسکرائی۔ دو ہاتھ، سوکھے مارے سے مگر محبت کی آگ سے تپتے ہوئے ہاتھ، جن میں خون کی رمق بھی نہ تھی۔ جن میں چوڑیوں کی کھنک نہ تھی، پالنے کی طرف بڑھے اور انہوں نے ایک ننھے منے گیلے گیلے وجود کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"مجھے تم سے ہی امید تھی منجھلی پھوپھی۔" رانی جیسے سرگوشی میں بولی۔

منجھلی پھوپھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ کیسی آواز تھی؟ یہ کیسی سرگوشی تھی؟ یہ کون ان سے اس قدر قریب ہو کر بولا تھا؟ انہوں نے کانپ کر بچے کو گلے سے لگا لیا۔

"میرے بچے! میرے بچے! میری جان!" ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

منجھلی پھوپھی اماں کی سب سے چھوٹی نند تھیں۔ جب اماں بیاہ کر آئی تھیں، تب تو وہ پیدا بھی نہ ہوئی تھیں۔ عمر میں وہ اپنے بڑے بھتیجے سے بھی دو چار برس چھوٹی ہی تھیں۔ بھتیجوں کے بیچ وہ گڑیا سی بہن نظر آیا کرتیں۔ نہ سمجھنے والے انہیں بھی اماں کی بیٹی ہی سمجھتے۔ اماں تو پتہ نہیں کون سا گن، کون سا ازلائی تھیں کہ چھ سات بیٹیوں کے ساتھ ساتھ چار بیٹوں کی بھی ماں بن بیٹھیں، ورنہ یہاں تو نسل در نسل یہی ہوتا رہا تھا۔ کہ ایک آدھ لڑکا ہو گیا جس سے خاندان چلتا رہا۔ جب اماں کی ساس مریں، اس وقت تک سب اولادیں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ بس ایک منجھلی نند ہی باقی رہ گئی تھیں۔ ساس نے اسے جیسے بہو کی گود میں ڈال دیا تھا۔ کچھ یہ نہ سمجھا کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔ وہ بھی سدا بھابی بھاوج

ہی میں گھلی ملی رہیں۔ دن بیتے اور اماں نے بیٹے بیٹیوں کے گھر بسانے شروع کئے تو تو منجھلی کو بھی اماں بن کر بیاہا۔ مگر رفو کو بھاوج کا ساتھ کچھ ایسا بھایا تھا کہ دور رہ ہی نہ سکی۔ جاڑوں کی ایک رات اس کے میاں نہا کر پنکھے کی ہوا میں سوئے اور صبح اُٹھے تو سارا جوڑ جوڑ جکڑا ہوا تھا۔ تین چار دنوں میں رفو کیا ۔ کیا ہوگئی۔ بھاوج نے لال کپڑوں سے وداع کیا تھا اور بھائی جب لائے ہیں تو سر سے پاؤں تک سفید، برف کی گڑیا بنی ہوئی تھی۔ جی کھول ہنسنا رفو کو راس نہ آیا۔ اس کے ہونٹ سل گئے، ارمان گھٹ گئے اور وہ جلی شاخ کی طرح جہاں کی تہاں رہ گئی۔ تاروں بھرا آسمان سر پر جگمگاتا۔ اور وہ دل میں اندھیرے لئے سسکتی رہی، جاڑے گرمی، برساتیں، خزاں، بہار، سب اس کے لئے ایک جیسی بات تھی۔ اور جیسے جیسے دن بیتے وہ بھتیجوں، بھتیجیوں کے بچوں کی دیکھ ریکھ کرنے کو جینے لگی۔ کوئی اسے گھڑک دیتا، کوئی دو بول سنا دیتا۔ کئی قصور نہ ہونے پر بھی ڈانٹ دیتا اور وہ خاموش اور معصوم آنکھوں سے دیکھ کر گویا اپنے ناکردہ گناہ کا اعتراف کر لیتی۔ میاں اچھی خاصی جائداد چھوڑ کر مرے تھے، سارا پیسہ اسی کے حصے میں آیا تھا۔ وہ چاہتی تو اپنا ایک گھر بار کر سکتی اور مزے میں جی سکتی تھی۔ مگر وہ انہی لوگوں میں جیتی آئی تھی اور وہ ان سے ہٹ کر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ تو بھری بہار میں اجڑ کر رہ گئی تھی۔ کون اسے دیکھنے اور سنوارنے والا بیٹھا تھا؟ بسنتی، اوڑھنی بھی تو کس کے لئے؟ سارا پیسہ انہی بچوں پر اُٹھا دیا کرتی۔ وہ مشین کی طرح ہر کام انجام دیا کرتی لیکن۔ لیکن اتنے دنوں بعد اب پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

ننھا شمیم ابھی دو ہی چار دنوں کا تو تھا۔ بے چارے نے ماں کا دودھ چکھا بھی نہ تھا۔ اس کی زندگی کا کیا بنے گا؟ ۔ کیا یہ پھول کمھلا کر رہ جائے گا؟ رفو نے بے بسی سے ان ماؤں کی طرف دیکھا، جن کی چھاتیاں دودھ سے لبریز تھیں اور محض دو گھونٹ اس ننھی سی جان کی زندگی کا سامان مہیا کر سکتے تھے۔ مگر اپنے خون سے کسی دوسرے کے لگائے پودے کو سینچنے کا ظرف کتنی ماؤں میں ہوتا ہے؟

منجھلی پھوپھی نے اپنے سینے کی طرف دیکھا۔ ممتا کے سوتے تو مدت ہوئی وہاں خشک ہو چکے تھے۔ پھر ۔ پھر انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی ۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا

اس کا خدا ہوتا ہے ۔ انہوں نے روئی کی بتی بنائی اور گائے کے دودھ میں بھگو بھگو کر ننھے
کے منہ میں ٹپکانے لگیں۔

زندگی کا یہ پہلا دور تھا، جب وہ خوشی خوشی جینا سیکھ رہی تھیں۔ بچپن تو جیا
بنا سوچا۔ بڑی ہوئیں تو ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بیاہ کر میکے سے سسرال آئیں تو
چند ہی دنوں میں ساری خوشیاں جل کر خاک ہو گئیں۔ نہ وہ کسی کے لیے جی سکیں۔ نہ
کوئی ان کے لئے زندگی کا سامان کر سکا۔ اب ان کی زندگی ایک نئی، پر بہار اور رنگین
راہ پر چل پڑی تھی۔ وہ جیتی تھیں ننھے کے لئے، مسکراتی تھیں ننھے کے لئے۔ اور پھر ننھا تو
سبھی کی خوشیوں کا مرکز تھا۔ کئی دن گزرنے پر اماں جی ہوش میں آئیں تو دیکھا کہ شوہر کی
گود میں رہ رہ کر ہمکتا تھا اور کوئی اُسے لینے کو ہاتھ بڑھاتا تو وہ منہ پھیر کر اس کے سینے میں منہ
چھپا لیتا۔ تینوں پوتیاں تو اماں ہی کی نظر شفقت کی مرہون منت تھیں، پوتا تو پورا کا
پورا ہی شوہر کا تھا۔ ایک دن اماں نے پیار سے عورتوں میں بیٹھ کر کہا بھی: ۔

"اب رفو بیگم جانیں اور نعیم میاں۔ میں نے تو ان کی گود میں ڈال دیا۔ اب وہ ان
کی ماں ہیں اور وہی ان کے بیٹے!"

رفو بیگم کا دل جیسے اپنی جگہ چھوڑ کر ان کی آنکھوں سے نکل پلکوں پر کپکپانے لگا۔ "میرا
بیٹا! میرا بچہ ۔۔۔!"

نعیم میاں ڈھیر ساری بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ کوئی انہیں پوچھتا نہ پوچھتا، ماں
اور دادی کی تو آنکھوں کے تارے تھے ہی تھے۔ بس کرو کرایا نیم چڑھ گیا۔ ابھی ایک برس کے
بھی نہ ہوئے ہوں گے، ضد کا وہ عالم تھا کہ کسی چیز کی ہٹ میں پڑ جاتے تو مچل مچل کر زمین آسمان
سر پر اٹھا لیتے۔ بڑے ابا ایک بار کہیں سے شیشے کا ایک گلدان لائے تھے۔ قیمتی اتنا نہ تھا جتنا
خوبصورت تھا۔ اور پھر جب چیز پرانی ہو جائے اور وہ کسی بزرگ کے ہاتھ کی لائی ہوئی ہو
تو وہاں قیمت کا سوال رہ بھی نہیں جاتا، وہ ایک قابل احترام چیز بن جاتی ہے۔ ایک
دن کہیں نعیم میاں نے وہ گلدان دیکھ لیا۔ ڈیڑھ پونے دو برس کے ہو رہے تھے۔ کھڑے
تو ہوتے ہی تھے، ذرا دور تک چل بھی لیتے تھے۔ گلدان سنگ مرمر کے پرلی طرف رکھا
ہوا تھا۔ پیر پھیلائے ہوئے گئے اور گلدان اٹھا لیا۔ قریب تھا کہ زمین پر دے مارتے کہ تائی بی

نے دیکھ لیا اور چلا کر دوڑیں :۔

"بے بے ابا میاں کے ہاتھ کا لایا ہوا ہے۔"

ہاتھ سے گلدان چھینا تھا کہ شمو نے چیخ چیخ کر حالت تباہ کر لی۔ لاکھ کھلونے دیئے جا رہے ہیں، لالچ دیا جا رہا ہے، مگر بولائے نہیں بہلتے۔ منجھلی پھوپھی کہیں باورچی خانے میں ان کے دودھ دلیے کی برابری کر رہی تھیں۔ وہاں سے چیخ چاخ سن کر نکل آئیں۔

"ہوا کیا ؟" وہ تیزی سے بولیں، "ذرا چھوڑ کر جاؤں تو جیسے سب اسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ آخر بن ماں کا ہے۔"

تائی تنک کر بولیں :۔ "بن ماں کا ہے تو جو چاہے کر لینے دیں ؟ ابھی گلدان توڑ دیا ہوتا۔ کوئی ایسی ویسی چیز تو ہے نہیں۔"

پھوپھی کو دیکھ شمو اور زور زور سے رونے لگا۔ رفو بیگم نے آگے بڑھ کر گلدان اس کے ہاتھ میں تھما دیا، اور دوسرے ہی لمحے خوشی خوشی شمو نے تڑ سے زمین پر دے مارا۔ مسرت کا سارا راز اسی تڑ میں پوشیدہ تھا۔

سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ تو سرے اونچی جا رہی ہیں۔ ایسے تو بن ماں کے بچے کو ڈیڑھ کوڑی کا کر دیں گی۔ کیا بچے کی ضد ایسے ہی پوری کی جاتی ہے ؟

دادی اماں کے کانوں تک شکایت جانے سے پہلے ہی منجھلی پھوا نے ایک نہ دو چار گلدان منگوا کر میز پر سجوا دیئے۔

یہ پہلا وقت تھا جب منجھلی پھوپھی کا دل پوری طرح ایک ماں کی طرح تڑپا تھا اور وہ اپنے جگر گوشے کے لیے سب سے لڑنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ یہ ایک ننھی، بالکل ہی ننھی سی بات تھی، مگر جیسے جیسے شمو بڑا ہوتا جا رہا تھا، پھوپھی کی محبت دیوانگی اختیار کرتی جا رہی تھی ان کی زندگی نے محبت کا لفظ سنا ہی نہ تھا، محبت کرنے، چاہنے اور چاہے جانے کی احساس لذت سے وہ یکسر محروم تھیں جو کبھی تو بیوی بن کر ملتی ہے اور کبھی ماں بن کر۔

شمو اپنی بہنوں میں بگڑا بیٹھا تھا۔ چڑی سی جان، نہ کسی بات کی سمجھ نہ اپنے پرائے کی تمیز۔ سب بچیاں کھیل رہی تھیں۔ چھپا چھپائی کا کھیل ہو رہا تھا۔ ٹھولا ٹھالی بھی چل رہی تھی، کسی نے سر پر ایک دھول جمائی۔ اس نے ادھر ادھر سر گھما کر دیکھا اور پھر

بے بسی سے پکارا :-

"امی"

رفو پھوا دالان میں کرسی پر سویٹر بنتی بیٹھی تھیں۔ اس کے اس طرح پکارنے پر پہلے تو وہ چونکیں، پھر ان کا پورا وجود تھرا گیا۔ امی۔ امی۔ امی۔

آج ایک ننھے سے وجود نے اپنی زبان سے پہلی بار ایک لفظ ڈھالا تھا، اور وہ لفظ تھا امی! اور امی کون تھی؟ سویٹر پھینک کر وہ لپکیں اور قریب پہنچتے ہی رک کر بے تابی سے ننھو کو اپنے سینے میں بھر لیا۔

"میں تیری ماں ہوں۔ ہاں تیری ماں ہوں۔ ایک بار پھر امی کہہ دے۔ کہہ دے میرے بچے! میرے بیٹے!" سینے سے اُبال سا اُٹھ رہا تھا۔ وہ پھپک پھپک کر روئے جا رہی تھیں اور ننھو کو اپنے سینے سے بھینچے جا رہی تھیں۔ آج ایک معصوم وجود نے انہیں فرش سے اُٹھا کر عرش پر بٹھا دیا تھا۔ آج تک وہ ایک عام عورت تھیں۔ مگر اب اُن کے قدموں تلے بھی ایک جنت تھی۔ ہاں وہ ایک ماں تھی!

ایک ماں کا نازک اور موم دل لئے اب وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھانے لگیں کہ کہیں ان کے پیروں تلے کسی کا معصوم دل کچل کر نہ رہ جائے۔ ماں بننے کی پہلی پہلی لذت سے گزر کر اب وہ اس دور سے گزر رہی تھیں، جب کہ ان کی اولاد نے انہیں ماں کہہ کر پکار بھی لیا تھا۔ اب ان کے سینے میں بجائے گوشت پوست کے دل کے، کانچ کا دل تھا، جو ہلکی سی ٹھیس سے بھی چور چور ہو جاتا تھا۔

رفو پھوپی سے اب نہ ممکن تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے وجود سے، اپنے دل سے "اپنی آنکھوں سے اپنے راج دلارے کو اوجھل کرتیں۔ ان کی سسرال سے ایک بار کسی عزیز کی شادی کا بلاوا آیا۔ انکار کرتیں تو کیسے؟ سسرال کا معاملہ تھا۔ اور ننھو کو ساتھ لے جائیں تو کیسے؟ وہ تو انہیں امی کہتا تھا! اگر کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نکال دیتا، تو چار لوگوں میں کیا عزت رہ جاتی؟ اکیلا پن کیسے برداشت کرتیں؟ مگر ٹال نہ سکیں اور اکیلے ہی جانا پڑا۔ کہہ گئی تھیں کہ رات ہونے سے پہلے ہی آ جاؤں گی، مگر وہاں وداعی میں اتنی دیر تھی کہ تارے کھل گئے، چاند چمک اٹھا۔ ان کے اپنے دل میں بھی

چاند کا عکس تھا اور آنکھوں میں تارے۔ لاکھ نا نا۔ نل کی گڑگڑ کرنا ہی پڑا۔

صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے چلنے کی سوچی۔ رات بھر نیند ہی کہاں لگی تھی جو اٹھنے نہ اٹھنے کا سوال پیدا ہوتا۔ وہ تو گھڑیاں گنتی بیٹھی رہی تھیں۔ اسی جاگل نے ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں گلابی ڈورے ڈال دیئے تھے، نیند کا نشہ الگ۔ جاگی جاگی آنکھوں کی گلابیاں رہیں سہاگ ان کی سوئی سوئی جوانی جیسے آج گہری نیند سے ہڑبڑا کر جاگ اٹھی تھی۔ انگ انگ چٹخا پڑ رہا تھا۔ اور جس وقت وہ چارپائی سے اتری ہیں اور زمین پر پاؤں رکھا ہے، ایک لمحے کو خود انہیں یہ محسوس ہوا، جیسے چٹ سے زمین ان کے وزن سے چٹ چٹ بول جائے گی۔

ہلکی ساری کے آنچل سے سر کو ڈھانپے قاتل آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتی نوکر کو کھوجتی پھر رہی تھیں کہ سامنے سے اشرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے پہلے تو یوں ہی لاپروائی سے دیکھا مگر ایک نگاہ جو پڑ گئی تھی، جیسے چپک کر رہ گئی۔ یہ رفو بھابی تھیں! رفو بیگم؟ رفو دلہن؟ رفو بیوہ؟ کتنے برس ہو گئے بیوہ ہوئے تھے؟ پرانے خیالات رکھنے والے لوگوں سے یہ کہاں ممکن تھا کہ اس قسم کی بات کا تصور بھی کر سکتے کہ بیوہ بہو کو پھر سے بیاہ لائیں۔ کیا ہوا اشرف مرنے والے کا چچازاد بھائی تھا؟ تھا تو ہر لحاظ سے قابل! اتنے دن گزر گئے مگر اشرف نے بھی کہیں شادی نہ کی تھی۔ یہ تو نہ تھا کہ دل میں بس رفو کی یاد کا دیپ جلائے ہی بیٹھا ہو، مگر سوچتا ضرور تھا کہ اگر یہ چراغ اسی کی تاریک کٹیا میں جل اٹھتا تو؟

ایک قدم۔ دوسرا قدم۔ تیسرا قدم۔ رفو عمر کے اس دور میں تھی، جب پھل کچے پن کی حدوں سے گزر کر پکنے لگتے ہے۔ گدرایا، گدرایا سا، رس بھرا، اور پہلے سے کہیں میٹھا۔ آنکھیں اُف یہ آنکھیں! شاعر ایسی ہی قاتل آنکھوں پر شعر کہتے ہوں گے۔ آنگن میں پلنگ ہی پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ سارے میں سوتا پڑا ہوا تھا، کوئی کروٹ لے رہا تھا۔ کوئی کسمسا رہا تھا۔ اشرف کو یہ موقع اچھا ہاتھ آیا۔ لپک کر آگے بڑھا اور بے چینی سے یوں بولا جیسے برسوں سے یہی ایک بات کہنے کو بے چین تھا:۔

"رفو، اکیلی کب تک زندگی بسر کرو گی؟ یہ سفر تو بہت ہی لمبا ہے اور تمہارے ساتھ نہ کوئی دوسرا ساتھی بھی نہیں۔"

رفو ایک لمحے کو سر سے پاؤں تک تھرتھرا اٹھی۔ بیوگی کے اتنے سارے بھیانک

سال — روتے گاتے، آنسو بہاتے، سسکتے ہوئے لمبے اور دُکھ دینے والے سال۔ اس کی آنکھوں کے آگے سے ایک لمحے میں گزر گئے — سارا!

قبول کروں؟ ساتھی بنا زندگی کٹتی بھی تو نہیں۔ یہ ایک لمحے کی بات تھی۔ اِدھر روتے سسکتے اتنے سارے سال اور محرومیاں تھیں، جوان زندگی اور بے خواب راتوں کے جان لیوا ستم تھے اور اُدھر ایک ننھا منا چاند تھا، ہنستا مسکراتا۔ امی! امی!

وہ چونکیں، پھر بڑے رسان سے، دھیمے سروں میں بولیں:—

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں اشرف بھائی۔ مجھے زندگی سے اب کوئی گلہ نہیں میں نے نورانی کے بچے کو گود لے لیا ہے۔"

ایک پھول کے لئے رضو پھوپھی سارے بھرے پُرے باغ کو — لہلہاتے باغ کو، ہنستے مسکراتے، لہکتے مہکتے باغ کو ٹھکرا آئیں۔ اب ان کا دماغ شمو کے علاوہ اور کسی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ عورت محبت کرنے پر آتی ہے تو اپنی ہستی کو مٹا دیتی ہے، چاہے وہ اولاد ہو یا شوہر۔ اپنا ہو یا پرایا، بس دل کی بات ہے، عورت نے دنیا میں شکست ہمیشہ اس محبت اور ممتا بھرے دل کے ہاتھوں ہی کھائی ہے!

دن ایسے ہی سر سر گزرے جا رہے تھے۔ اپنی جوانی اور حسن کی ساری رعنائیاں رضو پھوپھی نے جیسے شمو کو دے ڈالیں، ابھی ابھی وہ گھٹنوں چلتا تھا، ابھی ابھی اس نے اپنے گلابی اور نرم ہونٹوں سے رضو پھوپھی کو امی کہہ کر پکارا تھا، ابھی ابھی وہ اپنی تین پہیوں والی سائیکل پر بیٹھ کر مرغیوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا، ابھی ابھی اس نے اپنا بستہ اٹھایا تھا، اور قاعدہ اٹھا کر الف بے اور اے بی سی ڈی پڑھا تھا، ابھی ابھی اس نے گلابی چہرے اور ہنستی آنکھوں کے ساتھ آکر اپنی امی کو سنایا تھا:—

"امی امی میں چھٹی کلاس میں فرسٹ آیا ہوں" ابھی ابھی اس نے میٹرک میں فرسٹ کلاس فرسٹ آکر اُستادوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور ابھی ابھی وہ کالج سے سائیکل پر واپس لوٹا تھا۔ اور بڑے پیار سے اپنی امی سے کہہ رہا تھا۔

"امی، آپ نہیں سمجھتیں، آپ کی وجہ سے مجھے کتنی فکر لگی رہتی ہے۔ بھلا کوئی بات بھی ہے کہ میں اتنا بڑا ہو کر یوں آپ سے کام لوں؟ کیا میں ایک چائے کی پیالی بھی اپنے ہاتھوں

نہیں بنا سکتا۔؟"

رنو پھپھی مسکرائیں: "بیٹے تو نہیں جانتا، تیرا کام کر کے تیری ہنستی صورت دیکھ کر میرا دل کتنا بڑھ جاتا ہے۔ آخر ایک ماں اور اپنے بچّے کے لئے کر ہی کیا سکتی ہے!"

اک دم شمّو ذرا رکا اور آہستگی سے بولا: "امی آپ ہی میری امی ہیں نا!"

رنو پھپھی نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور بولیں: "کیوں اس میں تجھے کوئی شک ہے؟ وہی چڑیلیں زرینہ، شاہینہ وغیرہ تجھے ستا رہی ہوں گی نا؟"

"نہیں امی،" شمّو ہنس کر بولا، "ویسے تو سب ہی کہتے رہتے ہیں، آج کل سے نہیں بہت زمانے سے کہ آپ میری امی نہیں پھپھی ہیں۔"

"تو اس میں کیا فرق پڑتا ہے پگلے! بہر حال میں تیری ماں تو ہوں نا؟ کیا اتنی بات تیرے لئے کافی نہیں ہے؟"

شمّو کا چہرہ اتر سا گیا۔ رو ہانسا ہو کر بولا:۔

"امی ایسی بات نہ پوچھیے۔ دادی اماں سُناتی رہتی ہیں کہ آپ نے میرے لئے کیا کیا کیا ہے۔ رات کو رات نہیں سمجھا، دن کو دن نہ سمجھا۔ اپنی زندگی کا ہر ہر لمحہ، ہر ہر سکھ میرے لئے صرف کر دیا۔ اور تو اور آپ نے اپنی ساری جائداد بھی میرے نام کر دی۔ سچ کبھی کبھار میں خود کو بے حد گناہگار محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا....."

رنو پھپھی نے اک دم لپک کر اپنا سوکھا ہوا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"خدا کے لئے چپ رہ جا شمّو۔ ایسی بات کرتے تجھے ذرا سی شرم نہیں آئی۔ آخر میرے دل کا احساس کر۔ آخر میں کس کے لئے جی..... اور کس کے لئے مروں گی؟" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

شمّو رکا اور بے بسی سے بولا: "کہنے جیسی بات تو نہیں ہے امی، اگر واقعی آپ اپنی زندگی سنوار بھی سکتی تھیں۔ میرے وجود نے آپ کی زندگی کو جہنم بنا دیا۔"

رنو پھپھی تڑپ گئیں: "شمّو ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کا منہ تمتا رہا تھا اور زندگی کا ہر بیتا لمحہ جیسے ٹھٹھک گیا تھا۔ رک رک کر پھٹکار پھٹکار کر کہہ رہا تھا! "سچ کہنا، کیا تمہیں کبھی بھی بیتے دنوں پر افسوس نہیں ہوتا؟ کیا اپنی پھوپھو

کانچ کا دل

بھری جوانی کو یوں برباد کر کے تمہیں کوئی گھٹن نہیں ہوتی؟"

اُس رات شمو نے جب جب بھی پڑھتے پڑھتے سر اُٹھا کر امی کے پلنگ کی طرف دیکھا، پلنگ کو ننھی ننھی سسکیوں سے لرزتا پایا!

شمو میاں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے تھرڈ ایئر میں تھے کہ ان کی پسلی پھڑکی۔ اڑتے اڑتے یہ بات رفو پھوپھی کے کانوں تک بھی آئی۔ رفو پھوپھی کے دل کو کیا کیا ارمان لگے ہوئے تھے۔! انہوں نے تو طے کر رکھا تھا کہ کسی اچھے شریف خاندان کی بے حد پڑھی لکھی اور سگھڑ لڑکی کو اپنی بہو بنائیں گی۔ زندگی نے جو ستم ان کے ساتھ کئے تھے، گن گن کر ان ظلم و ستم کا بدلہ لیں گی اور بہو بیٹے اور پوتے پوتیوں سے بھرے پرے آنگن میں بیٹھ کر ہنستی ہنستی ہی اس دنیا سے دوسری دنیا کو جائیں گی۔ مگر لکھا تھا کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔ کیوں کہ شمو میاں نے جس جگہ دل لگایا تھا وہاں کسی کی مرضی نہ تھی۔ پتہ نہیں اپنے کون سے پروفیسر کی لڑکی پر ریجھ گئے تھے، خاندان کی بات تو جانے ہی دو، شہلا رانی ابھی میٹرک بھی نہ کر سکی تھیں اور مزے سے سائیکل پر دوپٹہ اڑاتی اسکول آیا جایا کرتی تھیں۔

اگر صرف رفو پھوپھی کا واسطہ ہوتا تو شمو میاں کو اتنی گھبراہٹ بھی نہ ہوتی، مگر یہاں تو پورے خاندان سے ٹکر لینے کا سوال تھا اور پھر ابھی تعلیم بھی ادھوری تھی اور نوکری کا کوئی نام و نشان ہی نہ تھا۔ یوں پیسہ تو اتنا تھا کہ چاہتے تو چار لوگوں کو کھلاتے تب بھی عمر بھر گھر بیٹھے کھا سکتے تھے، مگر گھر بیٹھا مرد بھی کیسا بھلا لگتا ہے۔

رفو پھوپھی لاکھ بے خبر تھیں مگر چہرے کی اڑی اڑی رنگت اور بہکی بہکی چال ڈھال سے بھانپ گئیں کہ شمو میاں نے ضرور کسی بلا کو پال لیا ہے۔ اِدھر اُدھر سے پوچھ تاچھ کی، ان کا خیال غلط نہ تھا۔ اماں بیگم کی سرکار میں جب پیشی ہوئی تو وہ کفن پھاڑ کر چلا اٹھیں۔ اور اُلٹے جب رفو پھوپھی نے بیٹے کی پشت پناہی کی تو وہ چلا اٹھیں: —

— جائداد کا جبر جو پہلے ہی اس کے نام کر دیا ہے۔ اور اوپر سے بہو بھی وہ اونچے خاندان کی لا رہی ہے۔ اری دیکھنا، تجھے دانے دانے کو ترسا دیں گے۔ پتہ نہیں اس کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ اونچ نیچ سمجھتی ہی نہیں ہے۔ عمر جیسی عمر ایسی ہی ناسمجھی کو گزار دی؟

مگر رفو پھوپھی چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ عشق تو شمو میاں نے کیا تھا، ہجر و فراق کے

اثرات ان کی صورت سے ہویدا تھے۔ رنگ پیلا، اُلجھے سُلجھے بال، ہونق چہرا، کوئی دیکھا تو یہی کہتا اب شب ہورہی ہیں۔ اس ضد ضدی میں سال بھر نکل گیا، مگر ننھو میاں کا جی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ وہی ایک لگن تھی، وہی ایک رٹ، تھک ہار کے بڑے بوڑھے بھی چپ ہورہے۔ تیز ہوا کے جھکڑ کے آگے گھاس پوس ٹکتا بھی کب ہے؟

رنو پھوپی نے اپنے جہیز اور چڑھاوے کے سارے جوڑے اور پورا زیور یوں ہی اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ بڑے جتن سے تمام چیزوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ گوٹے کناری پر نیا کپڑا لگوا رہی تھیں اور زیور کے فیشن بدل چلے تھے۔ تو ڈیزائن بدلوانے پر مصر تھیں۔ رہی سہی ساری پونجی اُنھوں نے شادی کے ہنگاموں پر لگادی وہ سچ مچ کی ماں نہیں تھیں تو کیا ہوا؟ ان کے سینے میں ماں کا دل تو دھڑکتا تھا! یہ وہی تو تھیں نا جنھوں نے رات رات بھر جاگ کر، روئی کی بتی بنا بنا کر اپنے ننھو کو دودھ پلایا تھا، اس کی دیکھ ریکھ کی تھی۔ نوکروں کی فوج ہونے کے باوجود ارمانوں کے ساتھ خود ہی تو موت کے بھرے پوتڑے، ٹرمالیاں دھوتی تھیں۔ یہ وہی تو تھیں نا جنھوں نے ننھو کی ہلکی سی بیماری پر اپنے آپ پر رات رات بھر کی نیند حرام کرلی تھی۔ یہ وہی تو تھیں نہ جنھوں نے اپنی زندگی کی ہر ہر خوشی، ہر ہر سکھ، ہر ہر پیار بھرا لمحہ ننھو پر قربان کردیا تھا۔ کیا ایک ماں اس وقت ماں ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے سینے سے ایک بچے کو دودھ پلادے؟ کیا محض اپنے بطن سے جنم دینے والی ہی ماں کہلاسکتی ہے؟ زندگی کی ساری خوشیاں نثار کردینے والی دُکھی روح کو پھر اور کیا نام دیا جاسکتا ہے؟ کیا سات آسمانوں کے اوپر رہنے والا اتنا نا انصاف تھا کہ وہ اُنھیں ماں پن کی لذّت سے محروم کردیتا؟

شادی کے دن رنو پھوپی کی خوشی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اپنے ہاتھوں اُنھوں نے ہر ہر کام نپٹایا تھا۔ مہمانوں، رشتہ داروں، دوستوں، نوکروں سے گھر بھرا پڑا تھا مگر وہ ہر ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھ سے، اپنی خوشی سے کرنا چاہتی تھیں۔ کیا ہوا جو ننھو نے ان کی پسند سے شادی نہ کی۔ زندگی کسے گزارنی تھی، ننھو کو یا اُنھیں؟ یہ تو اچھا ہی تھا نا کہ میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھ پہچان کر ہاتھ بڑھایا تھا، پھر وہ اپنے جگر گوشے کی خوشی پر کیسے نہ خوش ہوتیں۔

شادی پورے زور شور سے ہوئی۔ بارات بینڈ باجے کے ساتھ دلہن دلہا کو لے کر گھر آئی راستہ بھر آتش بازیاں چھوٹتی رہیں اور رنو پھوپی خود اپنے ہاتھوں پیسے لُٹاتی رہیں۔ آج کوئی رنو پھوپی

کی خوشی دیکھتا۔ بڑھاپے کے باوجود ان کے چہرے پر جوانی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ وہ رہ رہ کر مسکراتیں، ان کے پژمردہ اور پیلے چہرے پر آج گلابیاں اُمڈ رہی تھیں۔

دلہن کا کمرہ بھی خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ پھولوں کی بہتات سے کمرے پر کسی خطہ باغ کا گمان ہو رہا تھا۔ عقیش کے تاروں اور چاندی کے پتلے پتلے پھولوں سے مسہری جگ مگ کر رہی تھی۔ چھپر کھٹ پر دلہن سر نہوڑائے بیٹھی تھی اور رفو پھوپھی آتے جاتے، پُر مسرت انداز سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کب چاند چڑھے اور یہ کلی پھول بن کر مہکے۔

کھانے دانے اور ریت رسموں سے فارغ ہونے پر جب دولہا کو اوپر لایا گیا تو اچانک رفو پھوپھی نے محسوس کیا کہ سہرے کی لڑیوں میں سے جھانکتا ہوا شمو کا چہرہ کچھ اداس اداس سا نظر آ رہا ہے۔ آج کا دن — مسرتوں، ارمانوں، آرزوؤں کا دن — اور شمو کے چہرے پر پژمردگی! وہ بے کل بے کل سی، بولائی بولائی سی ادھر اُدھر پھرنے لگیں، کہ بھیڑ چھٹے اور موقع ملے تو وہ شمو سے کچھ بات کریں۔ مگر دلہن دولہا کے آس پاس وہ جھمگھٹا تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

رات کے بارہ بجتے بجتے سب ماؤں نے اپنے اپنے بچوں کو سلایا۔ مہمان بیبیاں موقع پا پا کر اپنے حجروں کوں میں گھسیں۔ باجے والوں نے شطرنجیوں اور شالوں میں لپیٹ لپیٹ کر باجے رکھ دیئے اور چھت خالی ہو گئی۔

شمو اکیلا کرسی پر بیٹھا رہ گیا تھا، دلہن اندر کمرے میں تھی۔ رفو پھوپھی بے تابی سے لپکی ہوئی آئیں اور چھوٹتے ہی بولیں:۔

"میرے لال! کیا بات ہے؟ چہرہ یوں اُترا اُترا سا کیوں ہے؟"

نسیم صاف ٹال گیا اور چہرہ نیچا کر کے بولا۔

"کوئی بات نہیں امی۔ آج تو میں صدا سے سوا خوش ہوں۔ آپ جی نہ کڑھایئے!"

مگر رفو پھوپھی کا جی نہ مانا، وہ گلے کا ہار ہو گئیں، اور قسمیں دے دے کر اس کی اداسی کا سبب پوچھنے لگیں۔ نسیم نے جیسے حلق میں پھنسا ہوا گولہ نیچے اُتارا اور اٹک اٹک کر بولا:۔

"نہیں میں بس یہی سوچ رہا تھا کہ اگر آج میری اماں ہوتیں تو کس قدر خوش ہوتیں"

"میری اماں!"

"میری اماں! ہائے"

"میری اماں! ہائے"

رنو پھپھی کا سر گھومنے لگا۔ زمین، آسمان، سب گھومنے لگے۔ تاروں بھرا آسمان چکر کھانے لگا۔ پیروں تلے زمین چکر کھانے لگی۔

اُنھوں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالنا چاہا، مگر ہر لمحہ وہ بے سدھ ہوتی جا رہی تھیں۔ جھٹ سے ان کو اپنے سینے میں کوئی چیز ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ اُنھوں نے دونوں ہاتھوں سے دل کو پکڑنا چاہا، مگر اسی لمحے ان کے ہاتھوں کا سارا زور ختم ہوگیا، اور وہ تیورا کر زمیں پر گر پڑیں......"

اے رُودِ موسیٰ

تم میری باتیں غور سے سُن رہے ہونا ..... ؟!

سترہ سال کی عمر میں مَیں خوبصورتی کا مکمل نمونہ تھی ــــ میرا جسم متناسب تھا۔ قد لمبا، ہاتھ پاؤں صندلیں۔ آنکھیں شراب کے پیالے ــــ رنگت ایسی جیسے کسی نے میدہ گلابی پانی سے گوندھ کر رکھ دیا ہو ــــ تم اگر اسے خود ستائی نہ کہو تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ میں نے دنیا میں خود سے زیادہ حسین شکل کوئی نہ دیکھی ــــ اور میرے اُس حُسن کا مول بھی بہت اونچا تھا۔

میری منگنی شہر کے ایک بہت بڑے رئیس کے ولایت پلٹ لڑکے سے ہو چکی تھی اور اسی لئے بھائی میاں مجھے بڑی سرگرمی سے چھری کانٹے سے کھانا کھانا سکھا رہے تھے ــــ کبھی کبھی میں کانٹا زبان میں چبھا لیتی ــــ یا چھری اس بے دردی سے ڈبل روٹی پر چلاتی کہ میری انگلی کٹ جاتی۔ اور نتیجے میں بھائی جان میرے سر پر ایک آدھ دھول جڑ دیتے ــــ اُنھوں نے ہزار بار بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ کانٹے میں لگے روٹی یا گوشت کے ٹکڑے کو دانتوں کی مدد سے بڑی آہستگی سے زبان پر اتار لینا چاہئے۔ مگر میں اکثر کانٹا اس انداز سے منہ میں رکھتی کہ زبان میں چبھ چبھ جاتا ــــ مگر کانٹے کی یہ چبھن بھی بھلی لگتی ــــــ یہ سب کچھ میں اپنی نئی زندگی میں داخل ہونے کے لئے ہی تو سیکھ رہی تھی نا ــــ ؟!

جب بھائی میاں مجھے کھانا کھانا سکھا رہے ہوتے، دالان میں اماں بیٹھی خشمگیں نگاہوں سے

بچے گھورے جاتیں۔

جس گھرانے میں میری بات لگی ہوئی تھی، وہ گھرانا بڑا ماڈرن تھا ـــــ وہاں کے سارے طور طریقے بالکل انگریزوں کے سے تھے، اماں ڈرتی تھیں کہ میں نے اپنی نادانی کی وجہ سے اگر کوئی الٹ پلٹ بات کر دی تو آ کر اجھا رشتہ ہاتھوں سے نکل جائے گا ـــــ ! ولایت پلٹ لڑکے بھلا کوئی روز روز ملتے ہیں جی ـــــ ؟ (تم میری باتیں غور سے سن تو رہی ہونا ـــــ !)

میں سوچتی اماں کے خدشے بھی بے بنیاد تو نہیں ہیں ـــــ کانچ کے نازک اور خوبصورت کھلونے کو کوئی ٹھوکر مار دے تو کیا انجام ہوتا ہے ـــــ ؟ وطن میں ہماری زندگی بھی تو ایسی ہی نازک نازک خوبصورت کانچ کے کھلونے ایسی تھی ـــــ وقت کی مضبوط ٹھوکر پڑی اور کھلونا چکنا چور تھا ـــــ پہلی زندگی کی یاد کو سے کر اب کرنا بھی کیا تھا ـــــ وہ ساری خوشیاں اور ولولے تو سرد پڑ گئے تھے ـــــ اب تو پیٹ کی آگ تھی اور کچھ نہیں ـــــ جسے کسی نہ کسی صورت بجھانا تھا ـــــ ابا راستے میں بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے اور لٹ پٹا کر ہم، اماں اور بھائی میاں کسی نہ کسی طرح بچ نکلے ـــــ ان دنوں میں کس قدر زندہ سی تھی ـــــ ؟ پھول کی طرح تازہ ـــــ کانچ کی طرح نازک۔ اماں مجھے اس طرح بچا بچا کر لائی تھیں جیسے مرغی چیل کو منڈلاتے دیکھ کر اپنے پروں میں اپنے بچوں کو چھپا چھپا لیتی ہے ـــــ میں اماں کے پروں میں دبی دبکی، پتہ نہیں کن کن راستوں سے گزرتی چلی آئی تھی ـــــ راستے میں کبھی کبھا آنکھیں کھول کر ذرا سا سر اٹھا کر ریل کی کھڑکی سے باہر جھانکتی تو رات کا بھیانک اندھیرا اور سناٹا جیسے میری روح سلب کئے لیتا ـــــ میں گھبرا کر پھر آنکھیں موند لیتی۔

زندگی کا پہلا سفر انہی اندھیروں میں کٹا ـــــ شاید اس دنیا کا یہی دستور ہے کہ جو لوگ ہلکی چلا کرتے ہیں۔ انہی کو اندھیرے ملتے ہیں ـــــ اپنے پیچھے ہم کیسی زندگی چھوڑ آئے تھے ـــــ ؟! بھرا پرا گھر ـــــ جنتا جیتا وہ باغ ـــــ پورٹیکو میں ابھی ابھی آ کر کھڑی ہوئی کار ـــــ وہ نیلے رنگ کے پردوں والا ڈرائنگ روم۔ اور ـــــ اور

(تم میری باتیں غور سے سن تو رہی ہونا ـــــ ؟!)

ہم آگے بڑھ آئے، زندگی وہیں رہ گئی ـــــ میں نے اپنی کتابیں کاپیاں جو میز پر کھول کر رکھی تھیں، شاید ابھی تک کھلی پڑی ہوں ـــــ ! میز کے کنارے میں نے دوات کا ڈھکنا رکھ دیا تھا ـــــ کون جانے وہ وہیں پڑا ہو ـــــ الجبرا کا ایک سوال میں نے ابھی پورا حل بھی نہیں کیا تھا ـــــ سنہری سنہری روشنی میں اپنی میز پر جھکی میں کس قدر مگن اور انہماک سے ادھورا سوال حل کر رہی تھی ؟! پھر میں وہ سوال کبھی حل نہ کر سکی، وہ سنہری روشنی وہیں کھو گئی ـــــ شاید دوات لڑھک گئی تھی جبھی تو سارے میں سیاہی پھیل گئی تھی ـــــ رات کی طرح تاریک اور ڈراؤنی ـــــ پھر سب کچھ

اس سیاہی، اس تاریکی میں ڈوب گیا ــــ مٹ گیا ــــ فنا ہو گیا اور ہم دھیرے دھیرے چوروں کی طرح اپنے ہی گھر سے یوں نکل آئے کہ پیچھے پلٹ کر دیکھ بھی نہ سکے ــــ میں تم سے پوچھتی ہوں اتنے دن گزرنے پر بھی یہ دکھ دل سے کیوں نہیں جاتا ــــ (ماہ و سال کے کندھوں پر رکھا ہوا یہ بوجھ ہلکا کیوں نہیں ہوتا ــــ کیوں نہیں ہوتا ــــ ؟! بولو ــــ بولو نا ــــ مگر نہیں ــــ مجھے اس طرح جذباتی نہیں ہونا چاہیے ــــ مجھے آج تم سے کوئی سوال نہیں کرنا ہے ــــ بس تمہیں سب کچھ سنانا ہے جی کا یہ بوجھ کسی طرح تو ہلکا پڑے ــــ دل کا یہ دکھڑا کوئی تو سنے ــــ میرے غم سے بھرے دل کو ایک ہلکی سی مسرت یہ تو مل جائے کہ کوئی تو تھا جس نے میرا غم بانٹا ــــ ! تمہارا یہ پرسکون انداز، تمہاری یہ خاموشی بتا رہی ہے کہ واقعی تم غور سے میری باتیں سن رہے ہو ــــ نا !!)

میں الجھے ہوئے دھاگوں میں سرا تلاش کرتے کرتے بھٹک جاتی ہوں ــــ بھول جاتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی تھی ــــ اتنی ساری باتیں یکدم سے زبان کی نوک پر آکر مچلنے لگیں تو کیسے کوئی راہ ہو سے؟ کیسے نہ میں ہرا کو دوں ـ !

ہم نے اس دیارِ غیر میں قدم رکھا تو کوئی آسرا نہ تھا ــــ کوئی سہارا نہ تھا ــــ بھائی میاں اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرنا چاہتے تھے مگر کوئی ذریعہ، کوئی آسرا نہ تھا ــــ وہ ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھتے تھے مگر صرف ایف ایس سی پر آکر ان کی گاڑی رک گئی ــــ میاں نے زندگی کے جو سہانے خواب بنے تھے، سب حالات کے تابع رہ گئے ــــ بھائی میاں جوتیاں چٹخاتے سارے شہر کی خاک چھانا کرتے کہ کہیں سے چار پیسے کا آسرا مل جائے اور ادھر میں اور اماں ایک تنگ تاریک سے مکان میں . . . (ایسا مکان، جسے مکان کہنے کو جی ہی نہیں چاہتا) زندگی کی دھوپ چھاؤں کے رنگ دیکھا کرتیں۔ کیا تم سمجھتے ہو ویرانے میں کھلنے والی کلی کبھی پھول نہیں بنتی ــــ ؟! میں اسی ویرانے میں کلی سے پھول بننے لگی ــــ اور سچ جانو ایک دن اس اندھیارے کمرے کی دیواروں نے پہلی بار چاند کی کرنوں کا سامنا کیا ۔ !!

بھائی میاں کو چالیس روپیہ ماہانہ کی بہت بڑھیا سی ملازمت مل چکی تھی ۔ جہاں وہ دن بھر مغز پاشی کرتے اور شام کو یوں لوٹتے جیسے ابھی ابھی مر جائیں گے ــــ کاش مر ہی جاتے زمین کی چھاتی پر کا بوجھ کچھ تو کم ہوتا ــــ ! مگر یہ سنو کہ ہم میں سے کبھی کوئی نہ مرا ــــ دنیا میں غریبوں کے لئے جینے کی تو کوئی راہ ہی نہیں، مگر مرنے کی بھی کوئی راہ نہیں ــــ کوئی کیا جئے کوئی کیا مرے۔

معاف کرنا۔ تم پتہ نہیں ہمارے متعلق کیا سوچو، مگر یہ بات بغیر سنائے میں نہیں رہوں گی کہ حالات کے باوجود میرا ایک اس قدر اعلیٰ گھرانے میں رشتہ طے پا جانا کس وجہ سے تھا۔ وہ محض بلیک سوٹ تھا ــــ ہاں اونی سوٹ ــــ گرے کلر کا ــــ بھلے ہی تم اسے برا کہو مگر میں

نہیں کہوں گی ـــــ اگر آدمی کو کھانے کو دے، پہننے کو نہ دے تو میں سمجھتی ہوں اُسے ہر عیب کو منہ کھلا چاہئے ـــــ بھائی میاں کئی دنوں سے ایک جوڑے پر گزارہ کر رہے تھے ـــــ چالیس روپے میں کیا ہو سکتا ہے ـ؟ شاید یہ بات تمہاری سمجھ میں نہ آ سکے ـ مگر ہم تو سمجھ سکتے ہیں نا ـــــ اس دن چکنی کالی لمبی سڑک پر جبکہ کوئی موٹر، سائیکل، بس نہ تھی، اکیلے بھائی میاں چلتے چلے آ رہے تھے اور ان کے آگے آگے ایک خوش پوش جوان ـــــ (ذرا سوچو غریبی کس قدر بڑی ستم ہے ـــــ) بھائی میاں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے اور پیچھے سے اس خوش پوش کی گردن پر ایک دھول جمائی ـــــ بھائی میاں ایسے کوئی ظالم تو نہ تھے کہ اسے جان سے مارنے کے بارے میں سوچتے ـــــ وہ تو بس اپنی ضرورت پوری کرنا چاہتے تھے ـــــ تھوڑی دیر بعد جب بھائی میاں اُسی تمکنت اور طمطراق سے سڑک پر چل رہے تھے تو ان کے جسم پر وہ قیمتی کپڑے کا سوٹ تھا اور اس خوش پوش نوجوان کے جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔

ہاں تب بھی نے جانا کہ یہاں قسمتیں بدل دیا کرتا ہے ـــــ بدل سکتا ہے ـــــ دیکھو ہم لوگ غریب مزدور ہیں، مگر اپنا عیب نہیں چھپاتے ـــــ بھائی جیت رہے نا ـــــ بس اسی لئے ـــــ رات کو بھائی میاں نے بڑے مزے سے بتایا کہ کس طرح وہ پلک جھپکتے میں ایک قیمتی سوٹ کے مالک بن بیٹھے تھے ـ اس رات ہم دونوں کتنی دیر تک ہنستے رہے تھے ـــــ! اُف بڑی بہت ـــــ کیسی خوشی تھی کہ بس ہنسی رکتی نہ تھی ـــــ!

دوسرے دن وہی سوٹ پہن کر بھائی میاں اپنی سروس پر گئے تھے ـــــ اللہ بہتر ہے کیا ہوا ؟؟ اسے اتفاق بھی کہہ سکتے ہیں ـــــ قسمت بھی کہہ سکتے ہیں ـــــ بہرحال ہوا یوں کہ جب بھائی میاں اپنی میز پر بیٹھے قسم چلا رہے تھے تو ان کا باس ان کے پاس آ کھڑا ہوا ـــــ پہلے وہ تو سر سے پاؤں تک ان کو دیکھتا رہا دیکھتا رہا پھر یوں گھوم پھر کر ان کے گرد پھیرے ڈالے جیسے کوئی قربانی کے لئے بکرا خریدنا چاہتا ہو ـــــ دیکھ لینا چاہتا ہو کہ کوئی لنگی تو نہیں ہے کانا تو نہیں لنگڑا تو نہیں ہے، بیمار تو نہیں ہے ـــــ بھائی میاں نے سر اُٹھا کر دیکھا اور گھبرا کر سر جھکا لیا۔

"آجکل تو یہ کپڑا ملتا ہی نہیں ـــــ کہاں سے خریدا مسٹر ـــــ" وہ بہت سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

"جی ـــــ جی ـــــ جی ـــــ" بھائی میاں ہکلا گئے اور بولے "اگر آپ کو یوں ہی بھلا لگتا ہے تو لے لیجئے نا ـــــ ایسی کون بات جل جائے گی میری ـــــ" باس مسکرا کر رہ گیا ـــــ

گھر آ کر پوری روداد بھائی میاں نے مجھے بتائی اور یہ بھی کہا کہ اس اہم فرض کو میں ہی انجام دوں۔ کہ ان کے پاس تک یہ سوٹ پہنچا دوں۔ ـ اس پر ان کے چہرے پر چڑانا سا جل رہا تھا ـــــ امید کا ہی ہو گا ـــــ!)

پہلے تو بڑی دیر تک میں بحث ہوتی رہی کہ میرا جانا مناسب ہوگا بھی یا نہیں ـــــ اور جب یہ طے ہو گیا تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ میں اتنے بڑے بنگلے پر جاؤں گی تو کس سگھڑ بنوں گی کیا ـــــ ؟

تم یوں لمبے لمبے سانس کیوں لے رہے ہو ـــ؟ ترل ـــ ترل ـــ ترل ـــ شاید سوچ رہے ہو کہ آگے میں کیا لکھوں گی ـــــ ہاں شاید تم یقین نہ کرو کہ زندگی کیا تھی ـــ کیسی تھی کس کم بخت کے پاس خوشی تھی ـــ؟؟ آنسو تھے تو تھے جو ہر موقع پر برس برس کر اندھیروں میں اجالے پیدا کرتے تھے ـــ خیر ـــ اس اکلوتی سفید ساڑھی کو جو اماں نے پتہ نہیں کس خیال سے سینت کر رکھی تھی، میں نے اپنے جسم کے گرد لپیٹا ـــ! اور تم ایک لمحے کو تو سوچو کہ اس سفید لباس میں میں کیا قیامت ڈھا رہی ہوں گی ـــ؟! یہ گال اس وقت مرجھا کر زرد پڑ گئے ہیں تو کیا ہوا ـــ؟ یہ لمبے لمبے بال اب دھول سے اَٹ گئے ہیں تو کیا ہوا ـــــ تب تو میں ایسی نہ تھی ـــ میں تو شبنم میں نہلایا ہوا تازہ تازہ پھول تھی، جس کی پنکھڑی پنکھڑی سے رس ٹپکتا تھا۔

حُسن اپنی قیمت   اپنی بولی اُٹھوانے چلا تھا   !

بھائی میاں نے پھاٹک کو ذرا سا دھکا دیا اور ایک بڑے بڑے بالوں والے پیلے رنگ کے کتے نے بھونک بھونک کر ہمارا استقبال کیا ـــــ بھائی میاں تو مصلحتاً باہر جا کر چھپ گئے اور میں وہیں کاغذ میں بستہ شدہ سوٹ سنبھالے سہمی سی کھڑی رہ گئی ـــ کتے کی آواز سن کر پہلے تو چپراسی اور پھر ایک خوبصورت سا جوان آدمی باہر نکل آیا۔

اب میں تم سے یہ نہ بتاؤں گی کہ کتنے لمحے یوں ہی گزر گئے تھے ـــ نہیں۔ ایک بھی لمحہ نہیں گزرا تھا ـــ نہیں نہیں ـــ شاید میں بھول گئی ہوں ـــ مجھے تو کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ ساری عمر گزر گئی تھی ـــ ایک صدی سے کم کیا گزری ہوگی ـــ نہیں شاید وقت ٹھٹک کر یوں ہی ساکت ہو گیا تھا ـــ وقت تو مگر کبھی نہیں رکتا نا ـــ؟ تو شاید میں ہی بھول رہی ہوں ـــ!

پھر میں ایک بہت سجے سجائے ڈرائنگ روم میں تھی ـــ ہمارے دلّی والے ڈرائنگ روم سے بھی بڑھ چڑھ کر سجا ہوا ـــ! تم کیا سمجھتے ہو میں اپنا ماضی بھول گئی ہوں ـــ بھول سکتی ہوں ـــ؟ ارے توبہ کرو ـــ عورت کے چار آنکھیں ہوتی ہیں ـــ دو چہرے پر ـــ دو پیٹھ پر چہرے پر کی آنکھیں تو سبھوں کو نظر آتی ہیں، مگر وہ جو پیٹھ پر ہوتی ہیں نا وہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ صرف عورت انھیں محسوس کرتی اور ان سے ماضی کو دیکھتی رہتی ہے ـــ یہ جیتی رہتی ہے ـــ مرد کی نگاہ مستقبل پر ہوتی ہے اور عورت ماضی کو دیکھتی، پلٹ پلٹ کر، مڑ مڑ کر بڑھتی ہے ـــ میں بھلا کیسے اپنا ماضی بھول جاؤں ـــ بچہ تھی تو کیا ہوا۔ عورت تو تھی ـــ!

میں سہمے سہمے پرندے کی طرح صوفے کے کونے میں دبکی بیٹھی تھی اور وہ بچوں کی طرح مجھ

سب ہو بتاؤ کر رہے تھے ــــ یہ لو ــ وہ لو ــ یہ کھاؤ ــ وہ چکھو ـ

اتنے میں کمرے کا پردہ ہٹا اور بھائی میاں داخل ہوئے ــ اپنے ازلی اور اکلوتے جوڑے میں ملبوس ــــ میں نے ذرا طنز سے باس کی طرف دیکھا ــــ "کیوں جناب حقیقت" میری نگاہیں یہی کچھ کہہ رہی ہوں گی اس کا مجھے یقین ہے ــــ کیونکہ اسی لمحہ میری نگاہوں کو پڑھ کر انہوں نے فوراً بھائی میاں سے کہا تھا۔ ــــ

"جمیل صاحب ــــ بات بے ڈھب اور اچانک ہی کہہ رہا ہوں ــــ مگر کیا آپ اپنی بہن کو میری دلہن بنانا پسند کریں گے ــ؟"

وہ باس تھے اور بھائی میاں ان کے ماتحت ــــ شاید کوئی اور موقع ہوتا، کوئی دوسرا مطلب ہوتا، تو ان کے لہجے میں اتنی بے تکلفی اور انداز گفتگو اتنا صاف صاف نہ ہوتا ــــ مگر بھائی میاں تو پاگل ہو رہے تھے۔

بھائی میاں اس قدر سرپھرا، اس قدر حیرت زدہ، اس قدر پریشان سے رہ گئے کہ منہ سے کچھ نکلا ہی نہیں ــ بڑی دیر بعد وہ بولنے پر آئے تو پھر بولتے ہی چلے گئے اور ہماری زندگی کی کوئی بات ایسی نہ تھی جو انہوں نے نہ سنادی ہو ــ!

"میں جلتا ہوں ــــ میں جانتا ہوں ــــ" وہ سگار کو میز پر ٹھپک ٹھپک کر اتنا ہی کہے جا رہے تھے ــــ

"آپ جانتے ہیں ہم کتنے غریب ہیں ــــ آپ کو معلوم ہوگا کہ میری بہن صرف ساتویں کلاس پاس ہے ــــ آپ تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہمارے پاس رہنے کو ڈھنگ کا مکان بھی نہیں۔ پہننے کو کپڑے بھی نہیں ــــ سونے کو بستر بھی نہیں ــــ اور ..."

اور انہوں نے بات کاٹ دی ــــ "اور آپ جانتے ہیں کہ میں ایک نواب باپ کا بیٹا ہوں ــــ اپنا ایک ذاتی بزنس چلا رہا ہوں۔ اتنی بڑی دولت کا مالک ہوں ــ اتنے بڑے بنگلے میں تنہا رہتا اور تنہا حقدار ہوں ــــ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں محض سیر کے طور پر ہزاروں روپے خرچ کر کے لندن ہو آیا ہوں ــــ اور آپ اب یہ بھی جانتے ہیں کہ میں آپ سے آپ کی بہن کا ہاتھ مانگ رہا ہوں ــــ اور یہ بھی بتا دوں میں پاگل نہیں ہوں ــــ آپ سے مذاق بھی نہیں کر رہا ہوں ــــ آپ کو دھوکا بھی نہیں دے رہا ہوں ــــ آپ کی بہن سے باقاعدہ شادی کروں گا"

وہ رکے ــــ آگے بڑھے ــــ میرے قریب آکر ٹھٹک گئے اور میرا چہرہ اوپر اٹھا کر بولے ــ

"یہ انسان نہیں ــــ پری ہے ــــ اور میں بہت حسن پرست واقع ہوا ہوں جمیل۔"

اور وہ امید بھری نگاہوں سے بھائی میاں کو دیکھنے لگے۔

اے رودِ موسے

تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا ـــــ ؟؟

ایک انسان، خدا بن کر ہماری زندگی میں آیا اور جسم پر آسمان بن کر چھا گیا !

زندگی کس قدر حسین تھی ـــــ ! کتنی خوشگوار ـــــ کتنی پیاری ـــــ مگر ـــــ مگر کیا انجام بھی اتنا ہی حسین، اتنا ہی خوشگوار، اتنا ہی پیارا ہو سکتا تھا ـــــ ؟

تم بے چین ہو رہے ہو ـــــ ہاں تمہاری ساکن سطح پر یہ کیسی ہلچل ہے ـــــ کیا میری باتوں سے تمہارے دل میں دُکھ کی لہریں پیدا ہو رہی ہیں ؟؟

اے رودِ موسیٰ ـــــ ٹھہر جا ـــــ تھم جا ـــــ میری باتیں سُن تو لے ـــــ میرے دل کا درد، اپنے دل میں بھر لے ـــــ میں اس درد کو اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی ـــــ نہیں لے جانا چاہتی ـــــ آج اپنی زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں کا حساب لے کر میں تیرے پاس آئی ہوں

سُن لے میری داستاں ـــــ سُن لے ـــــ سُن لے

زندگی پر چھائے غم کے گہرے بادل جیسے ایکدم چھٹ کر رہ گئے ـــــ زندگی میں سکون اور مسرت آگئی ـــــ یہ ایسی خوشی تھی جس کے بارے میں سوچا بھی نہ جا سکتا تھا ـــــ اماں میرے لئے کتنی پریشان رہا کرتی تھیں ـــــ غریبی اور حُسن جہاں ایک جگہ ہو جائیں وہاں آپ ہی آپ چرچا کھل جاتا ہے۔ جوانی بلائے جاں آتی ہے اور پھر کسی سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ـــــ اب نافۂ مشک کی طرح میری خوشبو گھر سے باہر نکل کر پھیل رہی تھی ـــــ زندگی جس راہ پر جا رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے اس کے سوا اور سوچا بھی کیا جا سکتا تھا ـــــ ؟ مگر بالکل اس طرح، جیسے کالی رات میں اچانک بجلی چمک جائے ـــــ اسی انداز سے ضیا میری زندگی میں داخل ہو گیا۔

بھائی میاں مجھے سر پر دھول دھپے جڑ جڑ کر چھری کانٹے سے کھانا کھانا سکھلانے لگے اور اماں مجھے رو رو کر گھورنے لگیں کہ میں یہ رشتہ کھو نہ بیٹھوں ـــــ !!

اے موسیٰ کے گہرے پانیو ـــــ اے بے تاب لہرو ـــــ ذرا میرے دل میں آ کر جھانکو۔

اے موسیٰ تیری زندگی تو اسی حیدرآباد میں گزری ہے، یہاں کے چپے چپے سے تیری شناسائی ہوگی۔ یہاں کی زندگی کا ہر ہر راز تیرے سینے میں مدفون ہوگا ـــــ مجھے یہ تو بتا کیا یہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ، بیٹیوں کے دلوں کا خون کر دیں ـــــ ! دولت کے بل پر اپنی بوڑھی رگوں کے لئے تازہ خون خرید لیں ـــــ کیا یہاں پیسہ ہی سب کچھ ہے ـــــ کیا نیکی، سچائی اور پیار کا کوئی مول نہیں ـــــ کوئی قیمت نہیں ـــــ ؟؟ میں ان اچھلتی مچلتی لہروں سے جواب مانگتی ہوں ـــــ بولو ـــــ بولو ـــــ مگر نہیں ـــــ مجھے آج کوئی سوال کرنا نہیں ہے ـــــ مجھے تو آج صرف اپنی داستان سنانی ہے ـــــ یہ دُکھ، یہ کرب، یہ غم میں اپنے سینے میں نہیں لے جانا چاہتی ہوں ـــــ

تہہ خانہ

میں پھول کی طرح ہلکی ہو جانا چاہتی ہوں ــــ

اس دن میں اور بھائی میاں ضیاء صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے ــــ وہ خود کہیں باہر گئے ہوئے تھے ــــ بارش زور شور سے ہو رہی تھی اور میں نے سردی سے بچنے کو اپنی ساڑھی کا آنچل اپنے کانوں اور سر کے گرد لپیٹ لیا تھا ــــ چپکے چپکے بھائی میاں نے مجھے دیکھا اور پیار سے ہنس کر کہا ــــ "مہر ــــ خدا کی قسم تو خطرناک حد تک حسین ہے ــــ کوئی حیرت کی بات نہیں جو ..... ضیا صاحب نے تجھے مانگ لیا ــــ مجھے تو فرشتوں کے بارے میں بھی شک کرنا پڑے گا ــــ!"

میں نے ذرا جھینپ کر سر جھکا لیا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے پھر سر اٹھانا پڑا ــــ کیونکہ کسی نے دروازہ کھولا تھا ....

ہم دونوں گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے ــــ وہ ضیا صاحب نہیں تھے، کوئی اور تھا ــــ آنے والے کی نگاہیں جیسے مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں ــــ اور خود میں بھی گھبرا کر بھائی میاں کو دیکھتی تھی، کبھی آنے والے کو ــــ

"آپ کی تعریف ــــ؟" آخر آنے والے نے بھائی میاں سے مخاطب ہو کر زبان کھولی

"جی میں جمیل ہوں ــــ ضیا صاحب میرے بہنوئی ہیں ــــ اور یہ ــــ یہ میری بہن ــــ مہر"

"تیکھا مہر ــــ" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور پھر بولا ــــ "اور میں ضیا کا والد ہوں، نواب آصف الدولہ ــــ نام تو سنا ہوگا میرا ــــ؟" وہ مسکرا کر میری طرف گھوما ــــ "حیدرآباد میں جتنی کوٹھیاں میری ہیں، اتنی شاید ہی کسی نے بنوائی ہوں ــــ اور پھر کوٹھیوں کی کیا بات ہے، بزنس وغیرہ بھی چلتے ہی رہتے ہیں ــــ اور ضیا میاں کو جو کام میں نے سونپا ہے وہ بھی بس ..." وہ خود ہی مسکرا کر رک گیا ــــ مگر ہم دونوں میں سے کوئی نہ مسکرایا ــــ پہلی ہی ملاقات میں، آتے ہی ایسی بے سر پیر کا ہانکنا ــــ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا ــــ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ سچ بھی ہو سکتا ہے ــــ یقین نہیں آتا تھا کہ اتنے عجیب انداز میں تو کوئی اپنے متعلق نہیں بتاتا ــــ اور حد یہ کہ کسی نے بھولے سے بھی نہ پوچھا تھا ــــ وہ پھر کہنے لگا ــــ

"جب کبھی اپنے بیٹے سے ملنے آتا ہوں تو بس یوں ہی کاٹ چھانٹ کر چلا جاتا ہوں ــــ نوکر چاکر مصاحبوں کے جھگڑے میں باہر نکلنا مجھے مطلق پسند نہیں ــــ کار بھی خود ہی ڈرائیو کرتا آیا ہوں ــــ پورے ساٹھ ہزار کی ہے"

یقیناً یہ شخص پاگل ہے ــــ میں نے دل ہی دل میں سوچا ــــ مگر اسے دیکھ کر میں اس قدر سہم گئی تھی کہ کچھ نہ کہہ سکی ــــ!

"تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ــــ؟ ذرا دل لگا کر سنو خدا کی بنائی یہ دنیا کیسی ہے"

بدلا بننے والے کیسے ہیں ـــــ تو تم جاننا چاہو گے نا کہ پھر ـــــــ! تو سنو اس بڑھے نے مجھے بھائی میاں سے الگ کیا ـــــ!

ترل ـــ ترل ـــ ترل ـــ یہ تمہارے سینے میں بے چینی کیسی؟ شاید تمہیں حیرت ہو رہی ہے ـــــ مگر اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ میرے شفیق اور مہربان دوست یہ دنیا ہے، یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے ـــــ اور جب بھائی میاں نے انکار کیا تو وہ سانپ پھن اٹھا۔ ان کے ذہن میں شاید مجھ ایسے بے بس روسا کی ہی کمی تھی جو وہ مجھ پر ہر حربہ آزمانے تک گیا ـــ اور پھر انسان نے انسان کے ساتھ، شیطان کی سی چال چلی ـــــ

روپیہ ـــ روپیہ ـــ روپیہ ـــ اس دنیا میں روپیہ کیا نہیں کر سکتا ـــ؟! کیا نہیں کر سکتا ـــ محبت کی بولی لگوا سکتا ہے ـــ پیار کا نیلام کروا سکتا ہے ـــ بہن کی محبت کو بکوا سکتا ہے ـــ تم جانو دس ہزار روپے معمولی چیز تو ہوتے نہیں ـــ بھائی میاں نے مجھے بہکانا شروع کیا۔

" صبرو ـــ تو یہ سوچ زندگی بھر روپوں پہ چلے گی ـــ ضیا جو اتنا امیر ہے تو نواب صاحب کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا ـــ نواب صاحب آسمان ہیں وہ پاتال ہے ـــ تو ملکہ بن کر راج رہے گی ہاں دیکھ انکار نہ کرنا ـــ "

میں کبھی غصہ کو چھپا کر ان کی طرف دیکھتی تو وہ میری سرخ رنگت کو شرم پر محمول کرتے۔ کیسی بے بسی تھی ـــ؟ ذرا سوچو نا ـــ

میں یہاں بھائی میاں کو بھی الزام نہیں دوں گی ـــ کیوں دوں؟ زندگی سے خوشیاں سمیٹنے کا حق ہر انسان کو ملنا چاہئے ـــ نہیں ملتا تو پھر وہ ٹیڑھے میڑھے راستے پر چلنا شروع کر دیتا ہے بھائی میاں نے اب تک کیسی زندگی گزاری تھی ـــ؟ ضیا نے صرف مجھے مانگا تھا ـــ میرے دکھوں کو سمیٹ کر اپنے دل میں چھپانا چاہتا تھا ـــ بھائی میاں کے سکھوں کے لئے اس نے کیا قیمت ادا کی۔ یہ کچھ بھی تو نہیں ـــ اگر یہاں انہیں کوئی فائدہ نظر آیا تو کیا برا کیا جو انہوں نے میری زندگی کی بولی اٹھا دی ـــ؟! یہ دنیا ہے میرے بوڑھے دوست ـــ یہاں ایسا ہی ہونا چاہئے ـــ!

بھائی میاں کے جسم پر اب بہترین کپڑے تھے، رہنے کو خوبصورت سا گھر ـــ اور زندگی کی ہر آسائش میسر تھی ـــ ایک دن نواب صاحب نے ہمیں خاص طور پر اپنے دولت کدے پر بلوایا تھا ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر جب ہم آگے بڑھے تو ایک لمحے کو میں چکرا گئی ـــ کیا اس قید خانے (وہ خوبصورت ہی سہی) میں مجھے رہنا ہوگا ـــ؟! میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا ـــ میرے خدا ـــ یہاں لوگ کیسے رہ سکتے ہوں گے ـــ؟ اتنی اونچی اور

ہیبت ناک دیواریں! کس میں بُوتا تھا کہ ان کو پھلانگنے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ــــ

نرم اور گہرے صوفے میں ایک بیگم بیٹھی ہوئی تھیں ـــــ بڑی رعونت سے دیکھتی ہوئی۔

بھائی میاں نے بڑھکر تعارف کروایا۔

"ان سے ملو ہیرا ـــــ یہ نواب صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں ـــــ اور یہ میری بہن ہے ہیرا"

میرا خون جوش کھا گیا ـــــ یہ میرا سگا بھائی تھا ـــــ میرا ماں جایا۔ جو نواب صاحب کی بیگم سے میرا تعارف کروا رہا تھا ـــــ میں نے بھوں بھوں کرکے اس کی طرف دیکھا ـــــ مجھے اس کی جیب سے نوٹ جھانکتے نظر آئے میں نے خود کو مطمئن کر لیا ـــــ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے ـــــ ایسا ہی ہونا چاہئے ـــــ اس کے آگے انسان اور سوچ بھی کیا ہے ـــ ؟؟

(تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا ـــــ ؟)

پتہ نہیں کن کن موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ـــــ پھر پردہ اٹھا اور ایک بانکی طرحدار لڑکی کمرے میں داخل ہوئی ـــــ پتہ چلا وہ نواب صاحب کی بیٹی تھی، (جو عمر میں مجھ سے بھی بڑی تھی) اس نے لڑکوں کی طرح پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ سر کے بال پوڈل کٹ (POODL CAT) کی شکل میں تھے ـــــ وہ مزے میں سگریٹ پھونکے جا رہی تھی اور دھوئیں کے مارے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ یوں تو ہم غریبوں کی زندگی دھوئیں میں ہی گزرتی ہے مگر تم جانو یہ دھواں تو دم گھونٹ دینے کو تُلا ہوا تھا اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور وہ لڑکی اُچھلی ـــــ اپنے ہونٹوں کا سگریٹ نکال کر اس نے جھٹ اپنی ماں کے منہ میں دے دیا ـــــ

"مما ـــــ تم ذرا اسے اسموک کرو ـــــ میں ابھی آتا ہوں ـــــ" مما خوشی خوشی سے اسموک کرنے لگیں ـــ!

میں نے ہڑبڑا کر دیکھا ـــــ یہ کیسی تہذیب تھی؟ یہ کیسی زندگی تھی ـــــ؟ کیا میں اس ماحول میں جی سکتی تھی ـــــ؟! میرا سانس رُک رُک کر چلنے لگا ـــــ بھائی میاں ٹھک ٹھک کر ہنس ہنس کر سبھوں سے باتیں کئے جا رہے تھے ـــــ میں وہاں تھی مگر نہیں تھی ـــ مجھے ہوش آیا تو وہ لڑکا نما لڑکی کہہ رہی تھی ـــــ "بو بیا! ایسا اشیو ہم لوگ ان میوزیم میں دیکھتے تھے نا ـــ"؟ اس کا اشارہ میری طرف تھا ـــ!

بھائی میاں نے اپنی بہن کے حسن کی تعریف کو بڑی خوشدلی اور فخر سے سُنا اور سینہ تان کر مجھے دیکھنے لگے ـــ "جیسے اس مال کا حقدار تو میں ہی ہوں ـــــ"

جب ہم باہر نکلے تو میرے قدم اس قدر وزنی ہو رہے تھے کہ مجھ سے چلتے نہیں بن رہا تھا ـــ دل اور دماغ میں اس قدر کشمکش ہو رہی تھی ـــــ کیا کروں کیا نہ کروں ـــــ؟! اگر مجھے نواب صاحب کے

جب بڑے ناسمجھ ہو جائیں تو چھوٹے خود بخود سمجھدار ہو جاتے ہیں" ــــ میں نے جل کر کہا ــــ

"بک بک مت کرو ــــ" وہ گرجے

میں نے ان کی طرف دیکھا

"بک بک تو آپ کر رہے ہیں ــــ میں تو ہمیشہ سے ہی خاموش طبیعت ہوں ــــ"

وہ تیزی سے اُٹھے۔ مگر جانے کیا سوچ کر رُک گئے ــــ بولے

"خیر آج میں کل تو جانے والی ٹھہری، اس لئے خاموش ہوا جاتا ہوں، ورنہ ابھی اس بک بک کا مطلب سمجھا دیتا ــــ"

میں نے اسی لہجے میں مضبوطی سے کہا ــــ میں نے طے کر دیا میں نواب صاحب سے شادی نہیں کروں گی ــــ اس سے اچھا تو یہ ہے کہ انسان خنجر کے ساتھ اس کے پیٹ میں جا رہے ــــ"

بھائی میاں میرے قریب آئے اور خونخوار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے ــــ

"نہیں کرے گی نواب صاحب سے شادی ــــ! ادھر تو تیرے باپ کا گھر بھر رہا ہے نواب صاحب سے ــــ! یہ عیش و آسائش اور کہاں سے مل سکتی ہے نا سمجھ کمینی ــــ بھول گئی کیا دو دو دن کے فاقے کرتی تھی، اندھیرے میں سوتی تھی، ننگی پھرتی تھی ــــ اب دھندے کو گھر مل گیا ہے ــــ پہننے کو ریشم مل گیا اور پیٹ میں ترسال پہنچ گیا تو دشمنی ہے حرام زادی ــــ

تم شکر رہے ہوتا ــــ! یہ میرا بھائی تھا ــــ سگا بھائی، جو یہ سب کچھ کر رہا تھا ــــ

ــــ میں نے جھلا کر کہا ــــ

" مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہئے ــــ مجھے اپنی وہی زندگی پسند ہے ــــ"

"بے نا فیرنی ــــ اپنی اصلیت پر ہی جانے والی ــــ مگر اب میں تجھے نہ چھوڑوں گا۔"

میں اسی تیزی سے نہیں نہیں کہے گئی اور بھائی میاں نے پیرے جوتا نکال لیا ــــ ان کا دم اُٹھ گیا میرا جسم نیلا پڑ گیا ــــ اور میں بے سدھ ہو کر فرش پہ گر پڑی ــــ

" دیکھتا ہوں کیسے نہیں کرتی ــــ" جاتے جاتے وہ پھر سنا گئے ــــ

پھر دھیرے دھیرے رات گزرنے لگی ــــ میرے نصیبوں کی طرح سیاہ رات آنسوؤں کے ستارے لئے دبے پاؤں میرے قریب سے گزرنے لگی ــــ چوٹوں سے میرا جسم درد کر رہا تھا زخم رس رہے تھے اور چپکے چپکے سر اُٹھا رہا تھا ــــ

" بھاگ چل ــــ خدا کی اتنی بڑی دنیا میں تیرا کوئی تو ٹھکانا ہوگا۔ یہی وقت ہے ــــ دیر نہ کر "

میں نے یہ پکار سنی اور سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا ــــ زیرو پاور کا بلب بڑی اداس روشنی بکھیر رہا تھا ــــ اماں کا کمرہ پرلے سرے پر تھا، بھائی میاں کے کمرے سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی اور ادھر

کر وہ چہرے اور بڑے بڑے دانتوں کا خیال آگیا اور میں نے طے کر لیا کہ میں اپنے آپ کو کبھی نہیں بیچوں گی ـــــ کبھی نہیں ـــــ کبھی نہیں ـــــ اس سے موت کیا بُری ہے ـــــ؟

میں نے بڑی ہمت کر کے، شرماتے شرماتے آہستگی سے بھائی میاں سے پوچھا۔

"نواب صاحب کو معلوم نہیں کہ میری شادی ضیا صاحب سے ہونے والی ہے ـــــ؟"

"معلوم کیسے نہیں ہے ـــــ میں نے انھیں پہلے ہی بتا دیا تھا مگر ـــــ وہ بات ادھوری چھوڑ کر یونہی رُک گئے۔

میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مگر اس لمحے مجھے کوٹ کی جیب سے نوٹ جھانکتے نظر آ گئے ـــــ میں نے سوچا ـــــ ٹھیک ہے ـــــ ٹھیک ہی تو ہے۔ اس کے آگے انسان کچھ نہیں سوچ سکتا ـــــ عقل چٹ ہو جاتی ہے۔

(تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ـــــ !؟)

گھر پہنچ کر بھائی میاں نے اماں سے میرے پیام کے بارے میں بات کی۔ اماں بھی راضی نہیں تھیں ـــــ "بیٹیاں تو اپنے گھر میں پلتی ہوئی ہی بھلی لگتی ہیں اور ایسی بیٹیاں تو کبھی کبھار ہی جنم لیتی ہیں جو ماں باپ کا گھر بھی بھرتی جائیں ـــــ ورنہ بیٹیاں تو سدا گھر ہی خالی کرتی گئی ہیں"

اماں کسی کام سے اُٹھ کر گئیں تو میں نے اپنی ساری ہمت سمیٹی اور منہ سے آواز نکالی ـــــ مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ وہ بات نہیں جو میں کہنے چلی تھی ـــــ میں کچھ بھی بک گئی ـــــ پھر سے میں نے ہمت جمع کی اور سوچا ـــــ یہ تو میری زندگی اور موت کا سوال ہے ـــــ خاموش رہنے سے کچھ نہیں بنے گا ـــــ مجھے کہہ دینا ہی چاہیے ـــــ اور میں نے پھر سے خود کو راضی کیا ـــــ

"بھائی میاں ـــــ" میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی ـــــ ان سے نظر ملانے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ میں نے پھر تھوک نگلا اور بولی ـــــ "بھائی میاں ـــــ"

پھر کچھ اس طرح جیسے بجلی دبا دینے پر پٹ سے گولی نکل پڑے، میں بول گئی ـــــ "میں نواب صاحب سے شادی نہیں کروں گی ـــــ"

ـــــ میرے دل پر سے جیسے پہاڑ ہٹ گیا ـــــ بھائی میاں خلاف توقع یوں ہی بیٹھے رہے ـــــ شاید وہ مجھے سوچ بوجھ کی مہلت دے رہے تھے ـــــ بڑی دیر بعد بولے

"مگر تم ابھی بچی ہو ـــــ"

میں نے تیزی سے کہا ـــــ "بچی ہوتی تو یوں میرا سودا نہ ہوتا ـــــ"

اب کہ انھوں نے چونک کر دیکھا اور خود بھی تیزی سے بولے ـــــ

"بہت سمجھدار ہو گئی ہو ـــــ !!"

میں نے دھیرے دھیرے خود کو سنبھالا ـــــ اور کسی صورت کھڑی ہو گئی ـــ جسم ٹوٹا جا رہا تھا۔
آنسو بہے جا رہے تھے اور سارا عالم ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا ـــــ پھر میں نے دھیرے دھیرے اپنے جسم
کو پیروں کے سہارے آگے بڑھانا شروع کیا ـــــ الوداع میری پیاری نانی ـــــ الوداع۔ میں
نے کمرے کی طرف دیکھا جہاں میری ماں سو گئی ہوئی تھی۔ اپنے دل میں کئی ادھوری حسرتیں لئے ـــــ
ـــ بیٹے کے بیاہ کی ـــ بیٹی کی وداعی کی، پوتے کھلانے کی، نواسے جھلانے کی ـــ آج یہ
سب حسرتیں ہمیشگی کی نیند سو رہی ہیں ـــ میری ماں الوداع ـــــ الوداع ـــــ
جلال میاں کے کمرے کی طرف منہ کر کے میں کتنی ہی دیر یوں ہی کھڑی رہی ـــ اے مالک تو
نے عورت کے سینے میں اتنا درد کیوں بھر دیا ـــــ ؟ جو اسے دکھ دیتا ہے، اسے ہی پیار کرتی ہے۔
جو اس سے نفرت ـــ کرتا ہے اسی سے محبت کرتی ہے ـــــ تو نے عورت کا دل، جس کا دل اتنا درد مند
کیوں بنایا ـــ ؟ اور ابے بھیا ـــــ الوداع ـــــ زخموں کے نشان جب تک میرے
جسم پر رہیں گے، پھول بن بن کر مہکیں گے اور تمہاری یاد دلائیں گے ـــــ آج تمہارا پیار دولت کے
انبار تلے دب گیا ہے مگر کبھی تو تمہیں اس دل کی یاد آئے گی جس کی ایک ایک ادا پر تم دل سے ہنستے
تھے۔ خوش ہوتے تھے پیار کرتے تھے ـــــ مسکراتے تھے ـــ الوداع ـــ
دروازے سے سر لگا کر میں کتنی ہی دیر کھڑی رہی ـــــ رات آہستہ آہستہ یوں جا رہی
تھی جیسے کوئی دلہن میکے سے پہلی بار سسرال کو چلے ـــــ ! قدموں میں وہی بوجھل پن ـــ دل
میں وہی غم ـــــ آنکھوں میں وہی آنسو رے ـــــ آج دو دلہنیں اپنے اپنے میکوں سے
لوٹ رہی تھیں ـــــ اے رات تیرا پیا تو افق کے اس پار تیرا منتظر ہے ـــــ تیرا پیا تو سورج کا
تلک لئے تیری راہ تک رہا ہے ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے تو بخت کی دہلیز پر قدم دھر دے گی اور تیری
زندگی میں صبح کا نور بھر جائے گا ـــــ مگر میں ! میں کون سے پیا کی منتظر ہوں ـــــ ؟ میری پیشانی پر
کون سے سورج کا تلک چمکے گا ـــــ ؟ میں کون دیش کو جا رہی ہوں ـــ ؟ غم کی ڈولتی پرچھائیوں
کے ساتھ میرے دل میں پیار کی روشنی، امیدوں کی کرنیں اور محبت کے پھول کیوں نہیں مہک
رہے ہیں ـــــ ؟ میں کہاں جا رہی ہوں ـــــ کہاں ـــ ؟؟؟
میں نے ایک بار پیچھے پلٹ کر دیکھا اور پھر آگے بڑھتی چلی گئی ـــــ تو سنا تم نے ؟
میں گھر سے نکل گئی ـــــ اور آج مجھے گھر سے نکلے پانچواں دن ہے ـــــ پانچواں ـــ اور
ان پانچ دنوں میں زندگی سے جی بھر گیا ہے ـــــ۔ ان پانچ دنوں کی کہانی بھی تمہیں سنا دوں پھر بھلا
دل ہلکا ہو جائے گا ـــــ پھر مجھے یہ غم نہیں رہے گا کہ دنیا میں کسی نے میری داستانِ غم سنی کہ
ہے کہ کبھی کسی سے کہی جی ہلکا تو ہو جاتا ـــــ ! تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ـــ ؟

میں گھر سے نکل تو گئی مگر معلوم نہ تھا کہ کہاں جاؤں گی ـــــ کدھر جاؤں گی ـــــ ایک جوان اور خوبصورت عورت کے لئے دنیا میں جگہ ہو بھی کہاں سکتی ہے ـــــ؟ میں صبح تک چلتی رہی ـــــ جب سورج نے ہر طرف روشنی بکھیرنی شروع کی، میں ایک نل کے پاس کھڑی تھی ـــــ میں نے چلوؤں میں پانی لے لے کر اپنا چہرہ دھویا اور جب گرد آلود بال جھٹکانے لگی تو نل کے پاس کھڑی عورتیں مجھ سے پوچھنے لگیں ـــــ

"کیا تم عورت ہو ـــــ؟"

میں ہنسنے لگی ـــــ عورت ہوں اسی لئے تو یہ دکھ اٹھانے پڑ رہے ہیں ـــــ میں نے دل میں سوچا ـــــ

میری ہنسی پر وہ اور حیرت زدہ ہوئیں اور آپس میں بولنے لگیں۔ ـــــ "صبح صبح آوارہ روحیں بھٹکا کرتی ہیں ـــــ یہ تو کوئی ہم تم جیسی عورت نہیں معلوم پڑتی ـــــ" اور وہ اپنے اپنے گھڑے اٹھائے گھروں کو بھاگ گئیں ـــــ مجھے پھر ہنسی آگئی ـــــ آج سارا زمانہ مجھ سے دور بھاگ رہا ہے، میرے دل نے درد کے ساتھ سوچا ـــــ میں نے آواز دی ـــــ "میں روح نہیں ہوں، ایک دکھیا عورت ہوں ـــــ میری بات تو سن لو، میرے دل کا درد تو دیکھ لو ـــــ" مگر وہ پیچھے نہ پلٹیں ـــــ میں ہی آگے بڑھ گئی ـــــ!

میں اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتی بڑھتی رہی، چلتی رہی ـــــ ایک آدمی نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری۔ میں تلخی سے مسکرا دی ـــــ عورت کے لئے کہیں جائے فرار نہیں ـــــ یہاں ہر آدمی نواب ہے جو پیسے دے کر عورت کو خرید لینا چاہتا ہے ـــــ میں اس کے قریب پہنچی اور لرزیدہ آواز میں بولی "بھائی صاحب آپ .... ـــــ"

اس نے ذرا غور سے میری صورت دیکھی اور پھر بوکھلا کر پلٹ گیا ـــــ "ہونہہ بھائی صاحب ـــــ!"

دنیا کس قدر گندی جگہ ہے ـــــ دیکھا تم نے ـــــ! ایک مرد عورت کو آنکھ مار کر اشارہ کر سکتا ہے کہ چل میرے ساتھ ـــــ لیکن عورت اگر اسے بھائی کا سایہ، مقدس رشتہ لگا کر سہارا مانگتی ہے تو وہ ہونہہ کر کر آگے بڑھ جاتا ہے ـــــ

میں نے پھر اپنے بے جان قدم بڑھائے ـــــ اتنے دنوں گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہی جو آج موقع ہاتھ آیا ہے تو دنیا اور دنیا والوں کو ایک نظر دیکھ تو لوں اور میں پھر ـــــ چلنے لگی ـــــ صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے شام اور شام کے بعد رات آئی اور پھر سے میرے زخم جاگنے لگے۔ یہ زندگی کی پہلی رات تھی کہ میں اپنے گھر سے ـــــ اپنی ماں سے، اپنے بھائی سے دور رہ کر سو رہی

تھی ـــ مگر کہاں !! چلتے چلتے میں قبرستان تک آنکلی تھی ـــــ میں نے سوچا ہم جیسوں کا سب سے اچھا گھر تو یہیں بن سکتا ہے ـــــ مگر میں نے کہا، نا کہ غریبوں کے لئے جینے کی تو کوئی راہ ہے ہی نہیں، مگر مرنے کی بھی راہ نہیں ـــــ زندگی اپنے بس کی نہیں ـــ ـــ موت بھی بس کی نہیں ـــ چھوٹی بڑی قبروں کے بیچ میں وہیں بیٹھ گئی ـــ اور کوئی موقع ہوتا تو شاید میں ڈر سے لرز لرز جاتی، مگر آج کی بات اور تھی ـــ پے در پے صدموں اور تنہائیوں نے جیسے ڈر کا احساس ہی چھین لیا تھا اور میں مزے سے یوں قبر کے پہلو بہ پہلو بیٹھی تھی جیسے سہاگ رات منا رہی ہوں ـــــ

پھر صبح ہوگئی ـــ مگر میری زندگی کی صبح کہاں تھی ـــ ؟ اور کون جانے میرے نصیبوں میں کتنی راتوں کی سیاہی لکھی ہوئی تھی ـــ !! بھوک سے میری چال ڈگمگا رہی تھی ـــ آنکھوں میں سیاہ دھبے ناچ رہے تھے اور چکر کے مارے قدم اٹھانا محال تھا، مگر میں چلی جا رہی تھی ایک جگہ جا کر میں ٹھٹھک گئی ـــ بہت سارے مرد، بچے اور چند عورتیں کسی کو گھیرے میں لئے کھڑی تھیں، میں نے جگہ بنا کر جھانک کر دیکھا ـــ گھنگھروؤں کی تال پر کوئی الھڑ سی عورت چھم چھم ناچ رہی تھی اور کوئی کوئی دل والا آنے دو آنے بھی پھینک دیتا تھا ـــ !

"ہاں زندگی کا ایک روپ یہ بھی ہے ـــ" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا اور پھر تھکے تھکے قدم اٹھانے لگی ـــ بڑی دیر چلتے رہنے کے بعد آخر میں ایک نیم کے نیچے بیٹھ گئی ـــــ

ـــ "ناچنا شروع کر دوں ـــ ؟" میں نے بہت معصومیت کے ساتھ سوچا ـــ پھر خیال آیا عورت ہو کر تو زندہ رہنا ہی مصیبت ہے ـــ دل والے مجھے کب زندہ چھوڑیں گے ـــ ؟ اس عورت کی بات اور تھی، اُس کے ساتھ اس کا ایک رکھوالا بھی تو تھا ـــ عورت کے لئے رکھوالے کا وجود بھی کس قدر ضروری ہے ـــ ؟ بغیر سہارے کے تو یہاں پتہ بھی نہیں ہل سکتا ـــــ

ـــ اُف ـــ میں کس قدر بے حیا ہوگئی ہوں ـــ ! شریفوں کا ناچنا ـــ ؟ بھلا کس نے ایسی ذلیل بات سوچی بھی ہوگی ـــ ! اُف یہ پیٹ !! ـــــ

بھوک کا شدید احساس پھر سے جاگنے لگا اور میں للچائی ہوئی نگاہوں سے اُس فقیر کو دیکھنے لگی جو ابھی بھیک کے دونے میں سالن لئے چیڑ چیڑ روٹی سے کھا رہا تھا ـــ میں نے بہت دیر تک اُسے دیکھا ـــ مگر اس نے میرا کوئی نوٹس نہ لیا ـــ شاید وہ صورت سے مجھے کوئی بھلے گھر کی لڑکی سمجھا ہوگا ـــ بڑی دیر بعد میں نے کچھ اس انداز میں جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں، کہنا شروع کیا ـــ (مگر دراصل میں اس فقیر سے مخاطب تھی) ـــــ

"میں بڑی دکھیا ہوں ...... ـــــ

اس نے ایک لمحے کو تو حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر دوسرے ہی لمحے ٹانگیں جھاڑتا ہوا یہ کہہ کر چل دیا ——— "اور نہ یہاں سبھی دکھی ہیں ——— کون کس کا دکھڑا سنتا پھرے ———"

میں اس جگہ گئی جہاں وہ بیٹھا تھا ——— روٹی کے چند ٹکڑے اِدھر اُدھر گر گئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی انہیں اکٹھا کر لیے اور ندیدوں کی طرح منہ میں بھرنے لگی

"تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا ——— !! ہاں ہاں یہ سب سچ ہے ——— جو ایک فقیر کے آگے کے ٹکڑے چُن چُن کر کھا رہی تھی ——— مگر مجھے اب حیرت نہیں ہوتی، کیوں کہ اس دنیا میں رہ کر میں نے جانا ہے کہ انسان کو ذلیل کروانے والا یہ پیٹ ہی ہوتا ہے ——— خالی پیٹ ——— اور یہ نہ بھولو کہ اُس لمحہ میرا پیٹ بھی خالی تھا ———

یہ دوسرا دن تھا جو میں گھر سے نکلی تھی ——— چند ٹکڑے کھا کر میری آگ اور بھڑک گئی۔

پتہ نہیں کیا جی چاہ رہا تھا ——— کسے کھاؤں ——— کسے پھاڑ ڈالوں ——— میں دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی بڑھی۔ ایک جگہ کچرے کے ڈبے کے پاس کیلے کے چھلکے پڑے تھے۔ میں نے بغیر کسی تکلف یا شرم کے وہ چھلکے اٹھائے اور جلدی جلدی منہ چلانے لگی ——— اب میں پھر اسی نیم تلے آ بیٹھی تھی اور راہگیر مجھے آتے جاتے بڑی شوق بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ——— ایک موٹے سے سیٹھ نے مجھے صدمہ کردہ انداز میں آنکھ مار کر دیکھا ——— میں نے متزلزل ہو کر اسے دیکھا ——— بدمعاشی اور بے حیائی میں عجیب کشمکش ہو رہی تھی ——— کوئی اِدھر کھینچ لیتا، کوئی اُدھر ——— میں بیچ میں ادھ مری سی بیٹھی تھی۔

چُپ چاپ تھی ——— یہ میں کیا سوچنے لگی ——— کیا میں اتنی نیچ تھی ——— !! کیا زندہ رہنا ایسا ہی ضروری ہے ——— !! کیا پیٹ کے لئے انسان اتنا بھی نیچ ہو جاتا ہے ——— مہر کیلیہ تم سوچ رہی ہو تم ——— تم خاندانی روایات بھول گئیں ——— دلّی کی تمہاری شاندار حویلی ——— تمہارے گھرانے کی وہ عزت۔ ——— تمہاری وہ لوگوں کے لئے قابلِ تقلید زندگی ——— اب تم اپنا جسم بیچو گی ——— !! ہر رات ایک نئی سیج سجا کر نئے نئے مردوں کے ساتھ سویا کرو گی ——— !! میں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں بھر لیں ———

"نہیں نہیں میں نے کبھی اس کے متعلق سوچا بھی نہیں ——— میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ بند کرو یہ بکواس ———"

اور پھر سب کچھ جیسے ساکت ہو گیا ——— بیٹھے بیٹھے ہی جانے کتنے جگ بیت چلے۔ مُردہ تصور کی دنیا تھی ——— حقیقت تو یہ تھی کہ ادھر سہ پہر کا وقت بیت رہا تھا اور معدے میں ترچھی ہو رہی تھیں ——— میں بنا کسی ارادے اور مقصد کے یوں ہی بے دلی سے اٹھی اور چلنے لگی۔ رکی تو میں ایک ہاسپٹل کے سامنے تھی ——— مریضوں کے رشتہ دار آ جا رہے تھے اور کسی کو اتنی فرصت

دیتی کہ وہ گھڑی کو رک کر میرا حال بھی پوچھ لیتا ___ اب دل برداشت کی حد سے اس طرح باہر ہو رہا تھا کہ جی چاہتا تھا چلا چلا کر ساری دنیا کو سنا دوں ___ دیکھو میرے دل کے گھاؤ ___ یہ وہ بدنصیب لڑکی ہوں جسے اس کے سگے بھائی نے بیچ دیا ___ دیکھو روپے کی طاقت کیسی ہوتی ہے کہ ماں جایا ایک بہن کے جسم سے خون کے قطرے اڑا دیتا ہے اور یہ پیٹ کی آگ ___

مگر کوئی نہ تھا ___ کوئی نہ تھا ___ چپراسی نے مجھے وہاں رکا دیکھ کر پوچھا ___

"اے لڑکی ___ تم وہاں کیوں کھڑی ہو ___"

میں نے خوشی خوشی زبان کھولی ___ "بابا ___ میرا اس دنیا میں اب......"

"یہاں ہم لوگوں کے دکھڑے سننے نہیں کھڑے ہیں ___ ہسپتال میں جانا ہے تو جاؤ۔ ورنہ راستہ چھوڑ دو موٹریں آ رہی ہیں ___"

تو یہاں کوئی نہیں ___ جو کسی بے کس کی ہائے ہائے سنتی ہے ___ یہ کیسی دنیا ہے مولا تیری ___ یہ کیسی زندگی ہے خداوندا ___ ؟ میں وہیں پیٹ ہٹ کر ایک کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی ___

میری زندگی میں آوارگی کا کوئی گزر نہ تھا ___ ورنہ ممکن تھا کہ میں بھی اپنے لئے کوئی راستہ ڈھونڈھ لیتی ___ مگر میں نے تم سے بتلایا نا کہ میں ایک شریف اور اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ___ بدچلنی کا میرے پاس ایک سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ___ اپنا جسم بیچ کر اپنے دوزخ کی آگ بجھانا ___ اس فلسفے کو ماننے کی میرے دل میں تاب نہیں ___

میں پھر چلنے لگی ___ چلتے چلتے میں شہر کے پُر رونق بازار میں آ گئی ___ ہر طرف رنگ و بو کا سیلاب تھا۔ موٹریں اُڑ رہی تھیں، عورتیں زرق برق کپڑے پہنے اتراتی پھر رہی تھیں ___

آدمیوں کا ہجوم تھا کہ بس چلا جا رہا تھا ___ ایک دریا کی مانند رواں دواں ___ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دو چار موٹریں رکیں، اسی طرح کھمبوں کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی عورتوں کو اشارے سے پاس بلایا گیا اور موٹر زوں زوں یہ جا وہ جا ___

"بیٹھ جاؤں میں بھی کسی موٹر میں ___ ؟" میں نے دل سے سرگوشی کی ہائیں نہیں نہیں ___ ایسا سوچنا بھی پاپ ہے ___ یہاں تو میں بس اس لئے کھڑی ہوں کہ زندگی کا تماشہ دیکھوں ___

میں جانے کب تک تماشہ دیکھتی رہتی کہ ایکدم کسی نے میرا کندھا تھپتھپا کر کہا

"کیا آپ چند لمحے میرے ساتھ گزار سکتی ہیں ___ ؟"

میں نے مڑ کر دیکھا ___ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا ___ نیلے سرج کے سوٹ میں ملبوس سر کے بالوں میں اکا دکا سفید بال بھی چمک رہا تھا ___ اونچا قد اور چہرے پر عجب بے کسی چھائی

ترجمہ:

ہیلو ــــ میں نے پھر اُسے غور سے دیکھا۔ اس کے تیور آوارہ گردوں کے سے نہ تھے ــــ نئے!
بھی مصیبت زدہ سا دکھائی دے رہا تھا ــــ

"میں آپ ہی سے مخاطب ہوں ــــ" وہ بڑی شائستگی سے بولا ــــ "کیا آپ
لموں کے لئے چل کر اس ہوٹل میں میرے ساتھ بیٹھ سکیں گی ــــ؟"

میں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا اور جدھر اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا، ادھر چل
ــــ ہم دونوں ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے اور اس نے آگے بڑھ کر میرے لئے ایک کرسی کھینچ
لیا اور خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا ــــ

زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی ہوٹل میں آئی تھی ــــ میں حیران نگاہوں سے
اُدھر دیکھ رہی تھی ــــ چھت پر بجلی کے پنکھے چل رہے تھے ــــ سامنے میں کپوں اور پ
کی کھڑکھڑاہٹ ہو رہی تھی ــــ سگریٹ اور سگار کے دھوئیں بکھرے کھانے سجے تھے اور ٹھنڈی ہوا
مجھے یہ سب کچھ عجیب خواب کی سی بات لگ رہی تھی ــــ ہمارے اطراف چند مرد بیٹھے
گپشپ میں مصروف تھے ــــ جیسے ہی انہوں نے مجھے دیکھا مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے
شاید میرے کپڑوں کی ہنسی اڑا رہے ہوں! ــــ میں نے دل میں سوچا اور بوکھلا کر
جھکا لیں ــــ

ــــ اس شخص نے بوائے کو جانے کیا کیا لا لانے کا حکم دے دیا تھا اور اب میز پوری ہوئی تھی
اور میری آنکھوں میں جیسے ستارے ناچ رہے تھے ــــ اس نے محض کھانا "لیجئے نا"
اور میں جیسے چل پڑی ــــ

وہ جیسے سُروں میں گویا ہوا ــــ

"آپ جانتی ہیں میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں ــــ"
اس لئے اس جملے پر مجھے اپنے سارے دکھ یاد آ گئے ــــ میرا تیزی سے کام کرتا ہاتھ
گیا اور میں بے بسی سے بولی ــــ

"میں بہت بدنصیب لڑکی ہوں ــــ آپ نہیں کہہ سکتے کہ میں کن مصیبتوں میں گھری ہوں"
ــــ اس نے میری بات یوں ہی کاٹ دی ــــ
"آپ اپنے دکھ ایک لمحے کو اپنے ہی دل میں محفوظ رکھئے۔ پہلے میری بات سُنئے ــــ
مگر میں اس کی بات نہیں سُن رہی تھی ــــ کوئی بھی ایسا دل والا نہیں ملتا جو
غم نصیب کے دکھ کو اپنے سینے میں منتقل کرے۔ وہ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا ــــ
"آپ جانتی ہیں میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں ــــ" "یا آپ بھی ہو

www.taemeernews.com

ت گزارنے نوبت سے ہو لے جاتے ہوں گے مگر ــــــ مگر اس کے بعد میں نے کچھ :

آپ جیسی عورتیں ــــــ آپ جیسی عورتیں ــــــ آپ جیسی عورتیں ــــــ

ہوٹل میں جیسے طوفان آگیا تھا ــــــ بادلوں کی گرج اور جہازوں کی گڑگڑاہٹ سے بھی بڑھ کر کوئی گونج گرج تھی جو مجھے بلا رہی تھی ۔ تھرّا رہی تھی ــــــ

چیخ ــــــ آپ جیسی عورتیں

آپ جیسی عورتیں ــــــ

میں نے کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے اور تیزی سے اٹھ بھاگی ــــــ بھاگتے ہوئے میرے ہاتھ سے دو تین طشتریاں اور کپ ڈھلک گئے اور برتنوں کے شور اور قہقہوں کی گونج میں، میں بھاگتی ہی چلی گئی ــــــ باہر آکر میں نے لمبی سانس لی ــــــ

یہ میری بارہ سال کا انعام تھا ــــــ یہ میری ریاضت اور پاکیزگی کا صلہ تھا ــــــ یہ دنیا ــــــ جہاں دلوں کا درد کوئی نہیں دیکھتا ــــــ تن کے دو بول کوئی نہیں کہتا مگر جہاں الزام خوب تراشے جاتے ہیں ــــــ عزتیں خوب رولی جاتی ہیں ــــــ کہاں جاؤں ــــــ ! کہاں جاؤں ــــــ میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا ــــــ آسمان روشن تھا ۔ پاس پاس ستارے کہکشاں جگمگ رہے تھے ــــــ اور ان سبھوں کے بیچ میں چاند تھا جو تیرتا چلا جا رہا تھا ــــــ اپنی منزل کی طرف ــــــ

"مجھے بھی روشنی دیدے ــــــ مجھے بھی اُجالے دیدے ــــــ" میں دکھے دل کو تھام کر بے بسی سے بولی ــــــ میں بھی اپنی منزل کو جانا چاہتی ہوں ــــــ مجھے روشنی چاہئے ــــــ مجھے زندگی چاہئے ــــــ ۔

اور میں وہیں گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھ گئی ــــــ اور پھر میں نے کچھ یوں محسوس کیا جیسے میں زمین پر گری جا رہی ہوں ــــــ میرے کانوں میں شور کی آوازیں اور راہگیروں کے قہقہے اور ہلکے ــــــ اور ہلکے ہوتے جا رہے ہیں ــــــ میرے سامنے ہسپتال کی بلند و بالا دیواریں تھیں اور ــــــ پھر کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا ــــــ

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو بستر پر پایا ــــــ میں ہسپتال کے بستر پر پڑی ہوئی تھی ۔ سفید سفید لباس پہنے ٹک ٹک کرتی نرسیں ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر آجا رہی تھیں ۔ اسٹیتھسکوپ گلے میں ڈالے ڈاکٹر، مریضوں پر مہربان نظریں ڈالتے ہوئے آجا رہے تھے ــــــ ایک نرس قریب سے گزری تو میں نے پوچھا ــــــ

"مجھے یہاں کس نے لاکر ڈال دیا ہے ــــــ ؟"

www.taemeernews.com

نرس ٹھنک کر بولی ——— "ہمارے کو نہیں معلوم ——— مریضوں کو اُدھر سے اڈمٹ کرتے ——— کوئی تمہارے بھائی بند ہی لا کر ڈالے ہوں گے ———"

"میرا بھائی بند ——— ! ہونہہ! ایک زہر خند مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی ———

وہ دن میں نے ہاسپٹل ہی کاٹے ——— نرسیں مشین کی طرح مصروف رہتیں ڈاکٹر شام سے آتے اور جلدی جلدی چلے جاتے ——— بازو کے بیڈ والے پیشنٹ کو اپنی ہائے ہائے سے فرصت نہ تھی ——— پورا وارڈ ہی آہوں اور کراہوں کا مسکن تھا ——— کون کس کا دکھ سننے بیٹھا تھا ———

ایک دن میں نے ڈاکٹر کے کوٹ کا دامن تھام ہی لیا ——— "ڈاکٹر صاحب میرے دل میں ہر دم ایک آگ سی لگی رہتی ہے ——— ! اس آگ کو بجھانے کی کوئی صورت بھی ہے ——— ؟

ڈاکٹر صاحب نے نرس کو آواز دی ——— "سسٹر ——— ٹمپریچر لو ——— دماغ پر گرمی کا اثر معلوم ہوتا ہے ——— بڑبڑا رہی ہے ———" میں نے تکیے پر سر پٹخ دیا ——— "میں پاگل نہیں ہوں ——— میرے دماغ پر گرمی نہیں ہے ——— میں سب کچھ سوچ سکتی ہوں ——— سب جانتی بوجھتی ہوں، مگر میں کہتی ہوں کوئی مجھ سے کبھی ہمدردی بھی جتائے گا یا میں یوں ہی مر جاؤں گی ——— ؟

——— نرس نے آکر شال سر سے پیر تک اُڑھا دی ———

"تماشہ مت کرو بی بی ——— دوسرے پیشنٹ جاگ جائیں گے ———" اور وہ میرے منہ میں تھرمامیٹر کی نلکی دے کر چلی گئی ———

میں نے تھرمامیٹر منہ سے نکال کر رکھ دیا اور جب نرس آئی تو اس سے بڑی لجاجت سے بولی۔

——— "مجھے کھانا چاہئے۔ بھوک لگ رہی ہے ———"

"اتنے بخار میں کھانا نہیں دیا کرتے ——— چین سے سو جاؤ ——— اُٹھنے کے بعد دودھ پی لینا ——— موسمی بھی رکھی ہے ———" اور وہ بے رخی سے چلی گئی

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا ——— ڈاکٹروں کی راؤنڈ کا ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ نرسیں اپنے اپنے کاموں میں تھیں ——— مریض بستروں پڑے ہائے وائے کر رہے تھے۔ پورے وارڈ میں عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا ——— کیسی غیر دلچسپ زندگی ہے خدایا۔ دو ایک دن میں ڈسچارج ہو جاؤں گی ——— پھر وہی زندگی اور وہی زندگی کے ستم! یہ دو دن کا آرام بھی کون بھلا لگ رہا ہے مجھے ——— ! میں نے بڑے بڑے موسمبی کھائی اور دھیرے دھیرے اپنے جسم کو اُٹھ بیٹھنے پر آمادہ کیا

www.taemeernews.com

سائے دو دو ہوئے

بڑے سے وارڈ میں سے ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی میں باہر نکل آئی ——— دروازے پہ چپراسی نے پوچھا ———

"کہاں جا رہی ہو ——— "

"گھر ——— " میں ایک ہی لفظ بول سکی ——— اور اس ایک لفظ نے پھر میرے دل میں غم ہی غم بھر دیا ———

وہ غیر یقینی انداز میں بولا ——— "گھر ٹکٹ کہاں ہے ——— ؟"

میں چڑ کر بولی ——— "تو کیا میں یوں ہی بھاگی جا رہی ہوں ——— ؟"

میرے لہجے سے وہ ذرا سہم گیا اور وہ بازو ہٹ گیا ——— میں دھیرے دھیرے ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکل گئی ———

اور آج پانچواں دن ہے کہ میں گھر سے باہر ہوں ——— اس گھر سے بھی جہاں میں اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ رہتی تھی اور اس گھر سے بھی جہاں تصوّر ہی میں سہی مگر میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سکون سے رہتی تھی ——— گھر جس کی لال اینٹوں کی دیواریں تھیں اور جس کے پھاٹک پر بوگین ویلیا کے قرمزی رنگ کے پھول، ہرے ہرے پتّوں میں چھپے مسکراتے جھومتے تھے ——— !

تم میری باتیں غور سے سنتی تو ہے ہونا ——— ؟!

وہی حیدر آباد کی سڑکیں تھیں ——— وہی راہگیر ——— وہی چہل پہل ——— اور وہی میں، جس کا دل قبرستان تھا ——— جہاں کتنی آرزوئیں پہلو بہ پہلو سو رہی تھیں ——— جنھیں خدا کا بارہ بھی زندہ نہیں کر سکتا تھا ——— !

میں بھوک سے نڈھال تھی۔ میرا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا ——— میری ساڑھی دھول اور گرد سے اٹ گئی تھی، میرا دل دُکھی تھا، جسم بے جان اور میرے آس پاس کروڑ چہرے تھے اور بھوکی نگاہیں ——— دل جیسے بار بار ڈوبا جاتا تھا ———

ایک راستہ ہے ——— ایک ہی راستہ ہے ——— چل پڑو ——— چل پڑو ——— پھر نہ دُکھ ہوں گے نہ غم ——— بس خوشیاں ہی خوشیاں ——— ہاں ایک ہی راستہ ہے۔ ——— کیا اس راستے کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ہے ——— ؟ کیا دنیا میں ایک بے سہارا عورت کے لیے سرائے چکلے کے اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے ——— ؟ کیا سارے راستے اسی منزل پر آ کر ختم ہوتے ہیں ——— ؟؟

اور یونہی قدم اٹھاتے اٹھاتے میں تم تک پہنچی ——— اور جیسے میرے دل میں ایک ساتھ کئی چراغ جل اٹھے۔ ———

www.taemeernews.com

۔ ارے مجھے پتہ ہی نہ تھا ـــ تم سے بڑھ کر اور کون منزل ہو سکتی ہے ـــ ! تم نے کتنوں کو سہارا دیا ہے ـــ کتنوں کے عیبوں کی پردہ پوشی کی ہے، کتنی آنکھوں کی فریاد سُنی ہیں ـــ کتنے دکھوں کو اپنے دل میں جگہ دی ہے میں ـــ میں بھی تو اسی درد کی ماری ہوں ـــ مجھے بھی تو یہیں پناہ مل سکتی ہے نا ـــ !! اے دریائے موسیٰ ـــ ـــ اے مہربان !

میں نے اپنے گرد آلود پاؤں پانی میں ڈال دیئے اور تم سے باتیں کرنے لگی ـــ انسانوں کے دلوں سے اچھا تو تمہارا دل ہے ـــ تم میری پکار اور فریاد کی آواز سُن کر بھاگے نہیں ـــ ورنہ یہاں کون کسی کا دکھ بانٹتا ہے۔ تم اسی متانت اور سکون سے بہہ رہے ہو ـــ تمہارے دل پر ساروں کے غم سمیٹ کر بھر لینے کی وسعت ہے ـــ اوروں کی طرح تم نے بے زار ہو کر منہ نہیں پھیرا، ہاتھ نہیں جھٹکا، طعنے نہیں دیئے اور غور سے میری باتیں سُنتے رہے ـــ

کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں ـــ ہاں ایسی اوٹ پٹانگ باتیں بس خواب میں ہی تو نظر آتی ہیں ـــ رستی بستی زندگیاں اور کیسے اجڑا کرتی ہیں ـــ !! تمہارا یہ سکون ـــ تمہاری یہ خاموشی ـــ کیا سچ تم نے میری باتیں غور سے سُنی ہیں ـــ !! ہاں سُنی ہیں، تبھی تو میرے دل کا بوجھ اب ٹل گیا ہے ـــ میں ہوا کی طرح ہلکی ہو گئی ہوں ـــ تمہارے دل کا سا سکون میرے اپنے دل میں رچ بس گیا ہے اور میں اب مرتے مرتے کس قدر مطمئن ہوں۔

ـــ کس قدر خوش ـــ !

کہیں یہ نہ کہنے لگنا، کس قدر بزدل اور ڈھیٹ لڑکی تھی جو یوں دنیا سے منہ پھیر لیا ـــ خدا را دل پہ ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ مجھ ایسی لڑکی کے لئے آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اور کون راستہ تھا ـــ ؟ اور کون منزل ہو سکتی تھی ـــ ؟؟ میں نے تو بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے ـــ اور میں اب کس قدر خوش ہوں ـــ میں اب دھیرے دھیرے پانی میں اتر رہی ہوں ـــ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی میرے جسم کو چھو رہا ہے ـــ اور میں زندگی سے قریب ـــ اور قریب ـــ اور قریب ہوتی جا رہی ہوں ـــ